بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بیادِ بیدل حیدری

انٹرنیشنل

ادب و ثقافت

9

مدیران

شکیل سروش ، شیخ اعجاز

رابطہ کیلئے

P.O.Box:210871, Milwaukee Wi 53221, USA.
Phone:+414-350-5594, +414-943-5594
E-mail:adabosaqafat@gmail.com
shakeelsarosh@gmail.com

178-Bamboo, Ave, SE., Palm Bay, FL.32909, U.S.A.
Phone:321-674-9837
Sheikh.ijaz.ahmed@gmail.com

www.adab-o-saqafat.com

مشاورت

احمد شہباز خاور (پاکستان) | محمود عامر (پاکستان)

جمشید مسرور (ناروے) | سجاد حیدر (برمنگھم)

لیاقت علی عہد (مانچسٹر) | شہزاد اسلم (لندن)

بابر شاہین (کینیڈا) | رامش منہاس (پاکستان)

ڈاکٹر نگہت نسیم (آسٹریلیا) | طاہر عدیم (جرمنی)

زیرِ اہتمام

فسٹ سٹیپ پبلی کیشنز امریکہ

First Step Publications, U.S.A.

ناشر

محمد عابد

مثال پبلشرز رحیم سینٹر پریس مارکیٹ امین پور بازار، فیصل آباد، پاکستان

Phone:+92 412615359- 2643841, Cell:0333-9933221

E-mail:misaalpb@gmail.com

فہرست

o حمد	اقبال اختر	7
o نعت	جعفر طاہر	8
o کربلا کربل، حسینؑ حسینؑ	اشرف یوسفی	9
o سلام	گلفام نقوی	10

مضامین

وحید احمد کی نظم ''مرمت کون کرتا ہے'' کا ایک تجزیاتی مطالعہ	ڈاکٹر کوثر محمود	11
''گروماں'' درد کا سیلِ درماں	خالد محمود خان	42
فکرِ اقبال کی تہذیبی جہت	ڈاکٹر شبیر احمد قادری	51
وجودیت	بازغہ قندیل	58

افسانے

سیاہ تل	دیوندر اِسّر	65
دستاویز	مظہر الزماں خاں	70
اُلٹے پاؤں	محمد حامد سراج	75
فرشتہ	گلزار ملک	82
شہزاد	سمیرا نقوی	88

غزلیات 93

بیدل حیدری جعفر طاہر صابر ظفر کاشف نعمانی جمشید مسرور رامش منہاس
عارف شفیق سجاد حیدر شہزاد اسلم محمود عامر لیاقت علی عہد طاہر عدیم
گلفام نقوی کاشف حسین غائر گل ریز فاطمہ شکیل سروش شیخ اعجاز

نظمیں 119

فہیم شناس کاظمی، جمشید مسرور، جلیل ہاشمی، احمد شہباز خاور، رامش منہاس، سمیرا نقوی، شیخ اعجاز

اپنی بات

ادب وثقافت انٹرنیشنل کا تازہ شمارہ حاضرِ خدمت ہے۔ہم کوشش میں ہیں کہ رسالہ آپ کی توقع کے عین مطابق ہو۔اس کو معیاری بنانے کے لیے ہمیں آپ کے مزید تعاون کی ضرورت ہے۔

پوری دُنیا میں تباہی کا سلسلہ جاری ہے۔قدرتی آفات،خون خرابےاور ماردھاڑ کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔خودغرضی، ہوس اور لالچ نے انسان کو اس قدر اندھا کر دیا ہے کہ ہم انسانی اقدار بالکل فراموش کر چکے ہیں۔ ہر شخص خود کو غیر محفوظ سمجھنے لگا ہے۔خوف وہراس کی تلوار سر پر لٹک رہی ہے۔لوگ ایک دوسرے کی جانوں سے کھیل رہے ہیں۔

حال ہی میں کراچی پاکستان میں جو کچھ ہوا وہ نہ صرف قابلِ مذمت ہے بلکہ قابلِ غور بھی۔ بم دھماکوں نے بے گناہ لوگوں کے جسموں کے چیتھڑے اُڑا دیئے۔معصوم جانوں کا اس قدر ضیاع، الاماں!

California کے مہنگے ترین علاقوں میں آگ نے وہ تباہی مچائی ہے جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔وہ لوگ جو برسوں سے عیش وعشرت کی زندگی گزار رہے تھے، آج خیموں اور Shelters میں پڑے ہوئے ہیں، جو لکھ پتی اور کروڑ پتی کہلاتے تھے، وہ اپنا سب کچھ لٹائے بیٹھے ہیں۔ہمیں عبرت کیوں حاصل نہیں ہوتی۔ہمیں ڈرنا چاہیے کہیں خدا کا قہر ہم پر بھی نہ ٹوٹ پڑے۔

—ادارہ—

حمد

—اقبال اختر—

شکوۂ ماہ و سال ہے سائیں
اب تو جینا محال ہے سائیں

اس فراوانیوں کے موسم میں
آدمیت کا کال ہے سائیں

فکرِ دُنیا ہے تیغ کی صورت
اور تری یاد ڈھال ہے سائیں

اِک کرم کی ہے آرزو دِل میں
اِک نظر کا سوال ہے سائیں

چھین ہم سے نہ درد کے سکّے
یہ غریبوں کا مال ہے سائیں

سائیں کی کیا مثال دوں اختؔر
آپ اپنی مثال ہے سائیں

نعت

—جعفر طاہر—

نہ جلوہ گاہِ خطا میں نہ دل ختن میں لگے
ہمارا دِل تو شہ دیں کی انجمن میں لگے

جہاں حضور گئے واں نہ جا سکے کوئی
اُڑیں تو آگ فرشتوں کے تن بدن میں لگے

وسیلہ بن گئے آخر مری شفاعت کا
ترے جنوں میں جو پیوند پیرہن میں لگے

کھلے کھلے نہ کھلے عقدۂ فراق و وصال
ہمارا دل تری زلفِ شکن شکن میں لگے

متاعِ باغِ کرم وہ گلِ بہار تو ہے
مہک سے اپنی جو ممتاز پنجتن میں لگے

ہزار داغ ترے عشق میں نصیب ہوئے
ہزار پھول تری نعت کے چمن میں لگے

اثر یہ غارِ حرا کے ہے سنگ ریزوں کا
کہ آج لعلوں کے انبار ہیں یمن میں لگے

میں نعت خواں جو ترا ہوں تو پھر عجب کیا ہے
شمار میرا بھی ہونے جو اہلِ فن میں لگے

نگاہِ ناز کا اعجاز دیکھنا طاہرؔ
وطن میں رہ کے بھی ہم اجنبی وطن میں لگے

—

کربلا کربلا، حسینؑ حسینؑ

—اشرف یوسفی—

علم علم پہ سرِ قافلہ حسینؑ حسینؑ
پسِ غبار ہے نقشِ بقا حسینؑ حسینؑ

زمیں سے تا بہ فلک تذکرہ حسینؑ حسینؑ
ہر اِک زباں پہ ہے صلِ علیٰ حسینؑ حسینؑ

کہا کہ ہے کوئی سجدہ ہو جس پہ ناز تجھے
زمیں سے آئی صدا پر صدا حسینؑ حسینؑ

کہا کہ تھا کوئی بعد از رسولؐ عینِ رسولؐ
نبوتوں نے ادب سے کہا حسینؑ حسینؑ

جلیس مسندِ عشق و وفا ہے کس کی ذات
بیک زبان تھے اہلِ صفا حسینؑ حسینؑ

کہا کہ کس کو ہے شہزادگیِ کون ومکاں
کہا کہ نوشئہ آلِ عبا حسینؑ حسینؑ

کہا کہ ہے کوئی تحریر تا ابد جو رہے
قلم نے لوحِ جہاں پر لکھا حسینؑ حسینؑ

کہا کہ اصغرؑ و اکبرؑ یہ قاسمؑ و عباسؑ
کہا کہ آئینہ در آئینہ حسینؑ حسینؑ

کہا کہ خطبۂ زینبؑ درونِ قصرِ یزید
کہا کہ شرحِ حدیثِ بقا حسینؑ حسینؑ

کہا کہ کیا تھے بہتر حسینؑ کے ساتھی
کہا مرید و مقامِ فنا حسینؑ حسینؑ

ریاضتوں کی ضمانت عبادتوں کا حصول
مرا سخن مرا حرفِ دُعا حسینؑ حسینؑ

بیاضِ فقر تو پڑھ مصحفِ یقین تو دیکھ
ہے سطر سطر پہ لکھا ہوا حسینؑ حسینؑ

کٹھن ہوئی کبھی پرواز برسرِ افلاک
تو قدسیوں نے پروں پر لکھا حسینؑ حسینؑ

کہیں جلے ہوئے خیمے، کہیں کٹے لاشے
کہیں لہو کہیں آہ و بکا حسینؑ حسینؑ

زمانے گزرے مگر کون دے رہا ہے صدا
ردا ردا میرے سر کی ردا حسینؑ حسینؑ

سلام

— گلفام نقوی —

ہر ایک لب پہ صدا ہے حسینؑ آئیے گا
اثاثہ لٹنے لگا ہے حسینؑ آئیے گا

گلی گلی میں یزیدوں کی چیرہ دستی ہے
پریشاں خلقِ خدا ہے حسینؑ آئیے گا

خدا کے گھر میں اُچھلتا ہے خون انساں کا
یہ وقت ، وقتِ دُعا ہے حسینؑ آئیے گا

یہ ظلم و جور کی آندھی بجھائے جاتی ہے
کہیں کہیں جو دِیا ہے حسینؑ آئیے گا

برہنہ سر ہے صداقت یزیدیوں میں گِھری
نہ کوئی خوفِ خدا ہے حسینؑ آئیے گا

وحید احمد کی نظم

''مرمت کون کرتا ہے''

کا ایک تجزیاتی مطالعہ

—ڈاکٹر کوثر محمود—

کراچی
رات کی گیلی ہوا میں سو رہا تھا
کیماڑی کا گھنا پتھریلا ساحل،
مچھلیوں کے حصے بخروں،
تیل کی گہری لزوجت،
اور سارے شہر کی میلی کثافت کو بلو کر،
سانولا محلول پیدا کر رہا تھا
کئی فرلانگ اندر،
گہرے پانی پر، اچھلتی کشتیوں میں
سیاہ ساحل بان عملہ گشت کرتا تھا
جزیرے سانولے پانی کے اوپر سیاہ دھبے تھے
منوڑا پر معلق نور مینارہ عمل میں تھا
ذرا ہی دُور اِک ویران مندر کا بدن تھا
اور اس کے سر پہ کالی کی ہتھیلی تھی
صلیبیں تن پہ چپکائے ہوئے گرجا کھڑا تھا
اور اس کے گرد مریم کا ہیولا تھا
مزار، اتنی اگربتیوں میں بھیگا تھا
کہ خوشبو ساحلی پانی کے اوپر تیرتی تھی
مچھیرے مچھلیاں تھے
اور ان کے گرد، خوابوں سے بھری نیندوں کا
گہرا جال کستا تھا
سمگلر اپنا دھندا ختم کر کے مشرقِ وسطیٰ کی جانب
جا رہے تھے
دبیز عینک کے پیچھے موسمی حالات کی پیشین گوئی
ہو رہی تھی
کلفٹن، دھند کا پشمینہ اوڑھے، اونگھتا تھا،
کسمساتا تھا
دھنسے مردہ جہازوں کے سیہ ڈھانچے، مسلسل عالم برزخ
میں زندہ تھے
نہ ان کو ریت کھاتی تھی
نہ ان کو دھند پیتی تھی
بس اک دوسُت سائے، ہاتھ میں چھڑیاں اٹھائے
چل رہے تھے
نیند جن سے روٹھ کر پانی کی تہ میں چھپ گئی تھی

سلیٹی مسجدوں کے چومکھی اسپیکروں میں
جب گجر دم فجر گونجی
تو سمندر نے سرکتے ساحلی تکیے پہ کروٹ پھیر کر
تاروں کی چادر تان لی
سورج ابھی کچھ دور تھا
لیکن کسی بے نام سے تیزاب سے،
کچی سیاہی کٹ رہی تھی

لرزتی،
کانپتی اک نوک اُبھری
جو ترقی کرتے کرتے اک سفینہ ہوگئی
سرکاری عملہ جھرجھری لے کر اٹھا
شب بین آنکھوں سے لگائی
لڑکھڑاتا، سیاہ دھبہ آنکھ میں فوکس ہوا
تو دیکھنے والے کی آنکھیں کھل گئیں
چٹخی ہوئی
اک آبنوسی چوب کی کشتی تھی
جس پر زنگ خوردہ دھات کا مستول تھا
قبل از مسیحی بادبانی چیتھڑوں کا
اک بے تدبیر عرض وطول تھا
بھیگی ہوا مزدور تھی
سر پھینک کر، کشتی کو دونوں ہاتھ سے کھینچتی ہوئی
ساحل کی جانب آرہی تھی

عرش پر تھا عرش والا
اور عرشے پر زمیں والا تھا

جس کے بت کے اندر اَن گنت صدیوں کی دانش
سانس لیتی تھی
جسے ہر دور میں دنیا پرستوں نے،
کبھی کڑواہراسیال دے کر نیل کر ڈالا
کبھی ہاتھ اور پاؤں میں گڑی میخوں کے رِستے خون سے
دھرتی رنگی
سُولی اجاگر کی
کبھی زندہ بدن سے کھال کھینچی، بیچ چوراہے میں
پھر خلق کے آگے
کبھی دل کی جگہ سینے میں جلتی گولیاں بھر دیں
مگر ہر بار اُس کے جسم کو ٹھنڈا کیا
کہ سانس جو بیدار سینے سے نکلتی ہے
کبھی ٹھنڈی نہیں ہوتی
ہمیشہ بات بنتی ہے
چمکتی بات، جس کو دیکھنے کا یار لوگوں میں نہ یارا تھا،
نہ شاید ہے، نہ شاید ہو

جب اُس کے پاؤں ساحل پر پڑے
تو ایک سوفسطائی وردی دار نے سختی سے پوچھا
کون ہے؟
''سقراط''
پورا نام کیا ہے؟
وردی والے نے قلم کا زاویہ کاغذ پہ پختہ کر کے پوچھا
''نام ہے یا چاند ہے؟ آدھا، کبھی پورا
کہو، کیا نام آدھا بھی ہوا کرتا ہے؟''
ہاں

سقراط آدھا نام ہے
سقراط علی، سقراط احمد، چوہدری سقراط چیمہ،
اپنا پورا نام لکھواؤ، یہ سرکاری ضرورت ہے،
''تمہارا نام کیا ہے؟''
تم کو اس سے کیا؟
''مجھے ہے۔۔۔
ٹھیک ہے۔صفدر علی ہے نام میرا،
''اور آدھا نام۔۔۔۔؟''
'صفدر'
''خوب؛علی کے بعد بھی تم نام کو آدھا سمجھتے ہو
یہ کس انداز کی ذہنی سہولت ہے
علی خارج ہوا، تو صفدری کتنی رہی باقی
''کبھی سوچا بھی ہے تم نے''
سو میں سقراط ہوں۔۔۔تنہا
نہ میرا سابقہ کوئی
نہ میرا لاحقہ کوئی
سنہرے رنگ کے سورج نے،
گہرے نیل کی چٹکی
سمندر کے کھلے برتن میں پھیری
دن کا میلا شب زدہ فرغل کھنگالا
پھر جھٹک کر آسماں کے تار پر پھیلا دیا

چبھتی ہوئی نظریں لئے،
اِک منحنی میلا سپاہی راستے میں آ گیا
کاندھے سے لٹکی پوٹلی کی گانٹھ پر
پتلی چھڑی کے بید سے چکیلی دستک دے کے بولا

''او بزرگا
میں مسلسل ایک گھنٹے سے تری مشکوک حالت پر
نظر رکھے ہوئے ہوں
پوٹلی میں چرس ہے یا ہیروئین ہے؟
شہر میں اڈہ کہاں ہے
اور باہر کس جگہ پر رابطہ ہے
سچ بتا دے
ورنہ تیری کھال کا جوتا بنا کر میں کراچی شہر ناپوں گا''
ذرا سا سوچ کر سقراط بولا
'ہاں
مجھے جوتے سے یاد آیا
مرمت کون کرتا ہے'
''مرمت!
جب ترے پاؤں میں رسا باندھ کر،
تھانے کی چھت سے اُلٹا لٹکایا
تو پھر معلوم ہو گا کہ مرمت کون کرتا ہے''
ہزاروں سال آنکھوں میں لئے سقراط نے نظریں سپاہی میں
اُتاریں اور پوچھا
'جب کبھی جوتا بگڑ جائے
جب اس کی کھال اُکھڑے
اور بخیے ٹوٹ کر بے سمت ہو جائیں
تو اس بے کار جوتے کی مرمت کون کرتا ہے؟'
سپاہی کی ہتھیلی سے چھڑی ساحل نے لے لی
اور وہ لکنت زدہ لفظوں کو باہم جوڑ کر بولا
''مرا مطلب ہے۔۔۔جی۔۔۔موچی۔۔۔بزرگو'
'اور جب انگشتری کا زر چٹخ جائے

مرمت کون کرتا ہے؟'
''جی۔۔۔سنیارا''
'کبھی لکڑی کے فرنیچر کی چولیں نرم پڑ جائیں
کبھی رنگ سے لبریز میخیں پرورش کرنے لگیں
باہر نکل آئیں
کھولت سے بھرے جوڑوں کی جنبش چیخ بن جائے
تو اس بے کار لکڑی کی مرمت کون کرتا ہے؟'
''بڑھئی''
'اور پھر
جب مملکت کا وہ سفینہ
جس میں ساری قوم بیٹھی ہو
مسلسل بحر کی طغیانیوں سے
تیرتے حشرات کی بسیار خوری
اور لمبی مچھلیوں کے وار سے بیکار ہو جائے
تو اس بگڑے سفینے کی مرمت کون کرتا ہے۔۔۔؟؟'
سپاہی ریت میں دھنستا گیا
بس کانپتا چہرہ ہوا میں رہ گیا

پھولے پپوٹوں میں لرزتی، سرخ آنکھوں کے کواڑوں
سے مسلسل جھانکتا اک شخص
ساری گفتگو کو سن رہا تھا
معتبر انداز میں گویا ہوا
''سقراط جی!
میں فلسفے کا مستند استاد ہوں
میں اور لوگوں کے علاوہ آپ کی تعلیم بھی بچوں کو دیتا ہوں
جہاں بھر کے بہت سے فلسفی،
تحقیق زیادہ با اثر کرنے کی خاطر
میری رائے کو کتابوں میں جلی حرفوں سے لکھتے ہیں
بھلا ان پڑھ سپاہی
قتل، چوری کے وقوعہ کے علاوہ
آپ سے کیا گفتگو کر پائے گا
چھوڑیں اسے
میں گفتگو کو پھر وہیں سے چھیڑتا ہوں
آپ کی یہ پوٹلی کیا ہے؟''

'پروفیسر!
مری اس پوٹلی میں وقت کے ٹکڑے ہیں
لمحوں کا بُرادہ ہے
کئی صبحوں کی قلمیں ہیں
کئی شاموں کا چورا ہے
تہجّی کی پرانی دھجیاں ہیں
جو ہوا
اس میں بھرا ہے
اور جو ہونا ہے۔۔۔اس میں ہے'
''مگر سقراط جی!
یہ وقت کے ٹکڑے یہ لمحوں کا بُرادہ
بھربھرے، بیکار، دقیانوس وقتوں کے جلے لفظوں کی
میلی راکھ ہے
اور آپ اس کو ساتھ والے ملک میں جا کر
اسی سہ پہر گنگا میں بہا دیں
تو بھلا ہو گا
مجھے معلوم ہے اس پوٹلی میں کیا ہے

فیثا غورثی صوفی پہیلی در پہیلی ہے
پروٹا گورسی شکوے گلے ہیں، ابتلائیں ہیں
کہیں تھیلیز کا پانی
کہیں جلتے ہیرَ کلیٹس کی چنگاری
پھر آخر آپ کیا ہیں
رات دن، بیکار، گلیوں میں اُبھرتے کچے ذہنوں سے
اُلجھنا،
پختہ سوچوں کی فصیلوں سے جو ٹکرانا
تو گر کر پاش ہو جانا
دعائیں دیجیے افلاطون کو
یا فوجی زینوفان کو
جو آپ کو لفظوں میں لے آئے
وگرنہ آپ بھی اس پوٹلی کی راکھ میں ہوتے''
'پروفیسر
میری اس پوٹلی میں عہد نامہ ہے
پرانا عہد نامہ بھی، جو کوہِ طور پر اُترا
نیا بھی
جس کے حروف وصوت کو انجیل کہتے ہیں
مری اس پوٹلی کو اہلِ دل زنبیل کہتے ہیں
کہ اس میں وید کے اشلوک ہیں
زرتشت کا بن باس ہے
بُدّھا کا پنجر ہے
تمہاری دھڑکنوں میں گونجتا ایمان ہے
قرآن ہے۔۔۔'

''سقراط جی

گر آپ نے جذبات بھڑکانے ہیں
تو لونڈوں سے ہی باتیں کیا کیجیے
ہمارے علم کا کچھ تو صلہ دیجیے
کہ ہم نے بھی تو آخر آپکی مانند ستر سال کا پھیرا نکالا ہے
یہ چاندی،
جو ہمارے سر میں اُتری ہے
کتابوں کی کڑی دوپہر نے دی ہے
کمالِ آفتاب و ماہتاب اس میں نہیں ہے
تو!
ہمارے ساتھ منطق کیجیے، ٹھنڈے لب و لہجے سے
جو کہ صاحبانِ علم کا ازلی وطیرہ ہے''
'پروفیسر!
مجھے تم فلسفی کس واسطے کہتے ہو،
جب میں بات کرتا ہوں،
کبھی لکھتا نہیں
جب بات سنتا ہوں کبھی لکھتا نہیں
محسوس کرتا ہوں، تو لکھ لیتا ہوں
دل قرطاس کرتا ہوں
لہو کی روشنائی کے علاوہ میرے لفظوں میں کوئی
رنگت نہیں۔۔۔۔ تو میں کہاں کا فلسفی؟''
''سقراط جی!
اب چھوڑیئے بھی!
آپ ہی کے نام سے تو ہم سخن آغاز کرتے ہیں
اگرچہ اختلاف اپنی جگہ
لیکن یہ ممکن ہی نہیں
کہ فلسفے کی بات چھلے

اور وہ سقراط سے محروم رہ جائے''
'پروفیسر!
سمندر اور دریا مختلف ہوتے ہیں
سو
سقراط بھی تو مختلف ہے فلسفہ سازوں کے دھارے سے
کہ جس کا اک کنارہ ڈھونڈیے
تو کھوج میں پہلا بھی کھو جائے،
''مگر سقراط جی
مردار بحرِ بے اماں بھی تو ہوا کرتا ہے
جس میں مچھلیوں کی سانس پانی میں نہیں چلتی۔۔۔''
'پروفیسر
سمندر مر بھی جائے تو سمندر ہے
کبھی دریا نہیں ہوتا
اسے دھرتی میں دفنانے کی کوشش کی
تو کیا ہوگا
کتابوں سے کبھی فرصت ملے
تو پھر کبھی ساحل پر آ کر سوچنا
کس برِّ اعظم کی زمیں کو کھود کر پانی اُتارو گے
کدالیں کون لائے گا
عموداً کون سی دھرتی کھڑی ہوگی
کہ لوحِ قبر بن جائے'
پروفیسر نے سوچا
اور پھر سقراط کے چہرے سے نظروں کو ہٹا کر گفتگو کرنے لگا
''سقراط جی
ہم گفتگو کو موڑ دیتے ہیں
زمانہ تیز رفتاری سے بڑھ کر برق رفتاری کی زد میں ہے
پرانے دور کے اسپارٹا، ایتھنز ہجرت کر کے
واشنگٹن ہوئے ہیں، ٹوکیو کہلائے جاتے ہیں
چنانچہ، سوچ کا دھارا بدلتا جا رہا ہے
شعوری، لاشعوری اور سب تحت الشعوری
خام سوچیں
اب نئی بھٹی میں گلتی اور ڈھلتی ہیں
بھلا میں آپ کو کیا کیا بتاؤں
جوہری ہتھیار
سرد و گرم جنگیں
چاند سے آگے جو سیارے ہیں
اُن پر زندگی کو ڈھونڈتی ٹیلی سکوپیں
سبزیوں کے بعد'
انسانوں کے خلیوں کو بدلتی
تجربہ گاہوں کے اندر پرورش کرتی کلوننگ
موسموں کے ساتھ سکّوں کے بدلتے رنگ
بنکاری،
مرکب سود، جس کی بھیڑ میں انسان مفرد ہو کے رہ جائے
خیالوں میں مچلتی
سرحدوں کو توڑ کر جغرافیہ تعمیر کرتی اشترا کی منڈیاں
پرواز کرتی آسماں چھوتی ہوئی افراطِ زر
سرمایہ کاری کے نئے رجحان
کمپیوٹر کے پیہم معجزے
ترسیل کا برقی نظام
اندوہ کرتے مشورے
میکانکی انداز میں
محنت کے رستوں پر نکلتے جسم

جن کے پاس
فکر ذات کو لمحہ نہیں ۔۔۔۔
اور آپ تو فارغ ہوا کرتے تھے
گلیوں میں نکل کر بات کرنے کے لئے
لوگوں کی شطرنجی دلیلیں مات کرنے کے لئے
سقراط جی!
اس وقت میں اور آج میں صدیاں گئیں
صدیوں کی کارستانیاں دیکھیں
تو یہ جو آپ کے اندر اُچھلتا چھل سمندر ہے،
چھناکے سے اُڑے۔۔۔ بادل میں ڈھل جائے‘‘
’پروفیسر
وہی انسان ہے، جو تھا
وہی آنکھیں، وہی چہرہ
وہی پنجر پہ لپٹا ماس، جنبش کھینچتا، چلتا
وہی شریان در شریان ٹھاٹھیں مارتا گہرا لہو
صدیوں نے جس کا رنگ نہ بدلا
وہی انسان کی کھالوں میں لپٹے بھیڑیئے
جن کے لبوں پر
اپنے ہم جنسوں کے جسموں سے ٹپکتا خون ہے
پھر خوں کی نمکینی، کمیت اور لزوجت بھی وہی
پہلے تو وہ گلّے سے اک دو ہی چنا کرتے تھے
باقی چھوڑ دیتے تھے
تمہاری اس صدی میں سارا ریوڑ کام آتا ہے
کبھی جنگِ عظیم اوّل
کبھی جنگِ عظیم آخر
شعاعوں سے بھرا اِک دائرہ گرتا ہے،
لوہے کے پرندے سے
پھر اس کے بعد کی نسلیں خسارہ ہی خسارہ ہیں
کسی ننھی ہتھیلی کے تنے پر انگلیوں کا پنج شاخہ تک
نہیں اُگتا
کوئی آدھی بصارت سے زمانہ دیکھتا ہے
مسکرانے اور رونے کے لیے
ہونٹوں کے کونے تک نہیں ہلتے
کہیں اک پوٹلی سونے کے بدلے سلطنت گروی
کہیں جب ناف کٹتی ہے
تو بچے کے گلے میں قرض کی زنجیر پڑتی ہے
کہیں بالشت جتنا ملک
اربوں ہانپتے سینوں میں سانسیں بانٹ دیتا ہے
کبھی جھٹکے سے سانسیں اس طرح سے کھینچ لیتا ہے
کہ جیسے عرش پر اس کے سوا کوئی نہیں بیٹھا
جنہیں تم میر جعفر، میر صادق کا لقب دشنام کرتے ہو
بہت معصوم تھے وہ لوگ
ان کا شر بڑا محدود تھا
اب اس گھرانے کے چراغ و چشم اپنے دستخط سے
ان گنت سینوں کی سانسیں بیچ دیتے ہیں
تم اپنی سانس سے پوچھو
تمہاری ہے
ادھاری ہے
یا گروی ہے۔۔۔؟
وہی انسان ہے، جو تھا
بس اک وحشت میں کاری ہو گیا
ورنہ،

وہی انسان ہے، جو تھا
ہماری بات لمبی ہو رہی ہے
مختصر یوں ہے
کہ کوئی ملک دھرتی کے خزانوں میں نہائی کوکھ سے
غربت لیے پیدا نہیں ہوتا
غریب اس کو وہاں کے لوگ کرتے ہیں
اگر دانش کے دھارے زہر سے لبریز ہو جائیں
تو ان کی تہہ میں اُجلی مچھلیاں رنگت بدلتی ہیں
پروفیسر!
کسی بھی ملک کے دانشوروں کی سوچ میں
اک بار جب غربت اُتر آئے
تو صدیاں چاہئیں
اس ملک کے ماتھے پر چپکی مفلسی کی رات دھونے کو
اگر سورج نچوڑو گے
تو اک قطرے کے آگے کچھ نہیں ہوگا،
پروفیسر سیاہی کی طرح ساحل کی گیلی رات میں دھنستا گیا
بس کانپتا چہرہ ہوا میں رہ گیا

پھر شام کو
سقراط جب واپس سمندر کی طرف بڑھنے لگا
تو جسم سارے ریت میں اُترے ہوئے تھے
ہر طرف چہرے ہی چہرے تھے
صلیب اک شخص کے ہونٹوں پہ چسپاں تھی
جبیں کوئی تلک والی
کسی کے سر پہ ٹوپی تھی
کسی چہرے پہ داڑھی تھی
کسی کے کیس لمبے تھے
مگر بچے زمین کی کھینچ سے محفوظ تھے
وہ کھیلتے تھے
ان کی ہر گردن میں
اک زنجیر تھی جو جھنجھناتی تھی
اُدھر سقراط کشتی کی طرف چہروں پہ چلتا جا رہا تھا
ادھر بچے اسے آواز دے کر کہہ رہے تھے
ہمیں معلوم ہے بابا!
مرمت کون کرتا ہے؟
اگر جوتا بگڑ جائے
اگر سونا چٹخ جائے
اگر لکڑی تڑخ جائے
ہمیں معلوم ہے بابا۔۔۔۔۔
ہمیں معلوم ہے۔۔۔۔۔''

وحید احمد کی نظم

''مرمت کون کرتا ہے''

کا ایک تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر وحید احمد کے بارے میں، میں اتنا جانتا تھا کہ ہماری ڈاکٹر برادری کا ایک فرد ہے اور CSS کر کے اکاؤنٹس گروپ میں چلا گیا ہے۔ 2002ء میں اک مشاعرے کے سلسلے میں فیصل آباد جانے کا اتفاق ہوا تو انجم سلیمی نے وحید احمد کی کتاب، ''ہم آگ چراتے ہیں'' تحفتاً پیش کی اور کہا کہ یہ وحید احمد کی دوسری کتاب ہے۔ پہلی کتاب ''شفافیاں'' ماورا سے دستیاب ہوئی۔ ''ہم آگ چراتے ہیں'' پڑھنے کی نوبت نہیں آئی یہ کتاب گھر میں کہیں گم ہو گئی البتہ ''شفافیاں'' سے وحید احمد کے یہ مصرعے میں کبھی کبھی اپنے گھر میں با آوازِ بلند پڑھتا

''ہمارے شیر خواروں سے ڈرو دشمن
یہ بچے خاندانی ہیں
اب و جد کی روایت کا بڑا وجدان رکھتے ہیں
انا کو پوجتے ہیں خون پر ایمان رکھتے ہیں''

میری اہلیہ اکثر مسکرا دیتی لیکن کبھی کبھی میرے ساتھ وحید احمد کو بھی بے نقط سنا دیتی۔ تقریباً دو سال بعد جب ہماری بیٹی پیدا ہوئی تو میں نے اپنی اہلیہ کی زبان سے یہ مصرعے سُنے وہ فاتحانہ انداز میں مسکرا رہی تھی اور کہہ رہی تھی کہ شیر خوار تو میرے ہیں بہر حال بات آئی گئی ہو گئی۔ ایک دن میں نے اپنے بیٹے بہزاد سارنگ اور بیٹی ایمن رویل کو دیکھا کہ وہ ایک کتاب پر لڑ رہے تھے۔ اُس کتاب پر ہر کوئی اپنا حق جتا رہا تھا۔ اس چھینا جھپٹی میں کتاب کا ڈسٹ کور بھی جواب دے گیا۔ بہر حال میں نے ان کو بہلا پھسلا کر اُن سے کتاب لے لی۔ یہ کتاب ''ہم آگ چراتے ہیں'' تھی۔

اس تمہید کا مقصد ہے کہ یہ کتاب 2002ء میں مجھے ملی اور 2007ء میں اسے پڑھنے کی

نوبت آئی۔اس کتاب میں شامل ایک نظم ''مرمت کون کرتا ہے'' نے دوبارہ اور سہہ بار قرأت پر مجبور کیا۔ یہ نظم پڑھ کر فرخ یار، ارشد معراج اور شاہین عباس سے میں نے ایک متعین سوال پوچھا کہ کیا اس نظم پر کوئی مضمون، کوئی تنقید کہیں چھپی؟

جواب نفی میں سُن کر جی چاہا کہ اس نظم کے حوالے سے کچھ معروضات پیش کی جائیں۔

ہماری روایت میں شاعری کو، ''شاعری جزوی است از پیغمبری'' تک کہا گیا ہے۔طویل رزمیہ نظموں میں قدیم ترین داستانِ گلگامش، مہابھارت، رامائن، اوڈیسی، ایلیاد، ڈیوائن کامیڈی، مدوجزرِ اسلام اور جاوید نامہ وحید احمد کے مطالعے میں آئیں اور اُس کے شعور کا حصہ بن کر رہ گئیں۔ یہ نظم وحید احمد کے عہد کی ترجمانی کرتی ہے اور بجا طور پر اس عہد پر ایک جامع ڈاکومینٹری کہلائے جانے کی مستحق ہے۔

اس نظم میں وحید احمد اپنے اس ایقان کا برملا اظہار کرتا ہوا نظر آتا ہے کہ سب کچھ تباہ ہو جائے گا لیکن اُس کی نظم باقی رہ جائے گی اور آنے والا مؤرخ اِس عہد کی تاریخ اس نظم کی روشنی میں لکھے گا بلکہ اس سے بڑھ کر بین السطور یہ پیغام ملتا ہے کہ یہ نظم ہی اس عہد کی تاریخ ہے۔

اس نظم میں وحید احمد معاملات کو ایک ڈاکٹر، ماہرِ معیشت، ایک مؤرخ اور ایک شاعر کی نظر سے دیکھتا ہے۔

بطور ایک ڈاکٹر کے وہ Rational Methodology (عقلی لحاظ سے پسندیدہ اور استدلالی منہاجیات) سے کام لیتے ہوئے معاشرے میں اہم پائے جانے والے امراض کی بروقت اور درست تشخیص کرتا ہے اور مؤثر علاج تجویز کرتا ہے۔

معیشت کے ماہر ہونے کے ناطے وہ ہمیں باور کرتا ہے کہ کسی معاشرے کی بقا کیلئے معیشت کا مضبوط اور وسیع بنیادوں پر استوار ہونا لازمی ہے۔

میرے خیال میں اگر وحید احمد نے عشق کیا ہے تو صرف تاریخ سے کیا ہے وہ لمحہ موجود کو بھی تاریخ ہی کے تناظر میں دیکھتا ہے۔اُس کا ہر استدلال تاریخ سے پیوستہ نظر آتا ہے اور یقیناً تاریخ اپنے دامن میں سب کچھ سموئے ہوئے ہے اور تاریخ کے دائرے کے باہر کوئی وجود ممکن نہیں۔

اپنی بات کہنے کے لئے اُس نے شاعری کو ذریعہ اظہار بنایا ہے یہ نظم مرمت کون کرتا ہے'' اُس کے ناول زینو کا دیباچہ معلوم ہوتی ہے۔

وہ اپنی بات کا آغاز یوں کرتا ہے

''کراچی

رات کی گیلی ہوا میں سو رہا تھا‘‘

وحید احمد نے اپنے خطاب کے مقام کے لئے ساحلِ سمندر کو کیوں چنا؟ وہ اس لئے کہ ماہرین ارتقا بتاتے ہیں کہ زندگی کا آغاز سمندر سے ہوا اور رفتہ رفتہ ساحل پر بھی زندگی کے آثار نمایاں ہوئے۔

لفظ کراچی سے نظم کے لوکیل Locale کا تعین ہو جاتا ہے۔

کراچی، سطحِ سمندر سے 8 میٹر نیچے آج پاکستان کا سب سے بڑا اور گنجان آباد شہر ہے۔ ابتداء میں بلوچستان اور مکران کے مچھیروں کی چھوٹی چھوٹی بستیاں تھیں جنہیں کُلاچی (Kolachi) کہا جاتا تھا۔

تاریخ سے عمومی دلچسپی اور یونانی دیومالا سے بالخصوص لگاؤ کی وجہ سے وحید احمد اپنی بات کا آغاز کراچی سے کرتا ہے۔

یونانی کراچی کو کروکولا (krokola) کے نام سے جانتے ہیں۔ جب سکندرِ اعظم وادئ سندھ پر اپنی یلغار کر چکا تو یہیں پر اُس نے بابل (Babylone) پر حملہ کرنے سے پیشتر کیمپ لگایا تھا اور کراچی کے قریبی جزیرے مورونٹوبارا (Morntobara ممکنہ طور پر جدید منوڑا) سے سکندرِ اعظم کے امیر البحر نی آرکس (Nearchus) نے اپنے ملک واپسی کا قصد کیا تھا۔

عرب اس شہر کو دیبل کے نام سے جانتے تھے۔ 712ء میں محمد بن قاسم کی صورت میں اس شہر نے پہلی اور بڑی بیرونی مداخلت کا مشاہدہ کیا برطانوی مؤرخ ایلیٹ (Eliot) کے مطابق دیبل کا شہر موجودہ کراچی اور منوڑہ پر مشتمل تھا۔

موجودہ شہر کو ایک سندھی مچھیرے مائی کولاچی (Maikolachi) نے آباد کیا اور اپنے خاندان کے ساتھ رہنا شروع کیا۔ بعد ازاں اس بستی نے بڑھتے بڑھتے گاؤں کی شکل اختیار کر لی اور اس کا نام کولاچی جو گوٹھ پڑ گیا۔ (سندھی زبان میں گاؤں کو ’’گوٹھ‘‘ کہتے ہیں)۔

1700ء کے اواخر میں اس گاؤں کے باشندوں نے مسقط اور خلیجِ فارس کے پار تک تجارت شروع کر دی۔

1795ء میں کراچی تالپوروں کی عملداری میں چلا گیا۔ 1799ء میں انگریزوں نے یہاں ایک چھوٹا سا کارخانہ لگایا لیکن ایک سال کے اندر بند ہو گیا۔ 1839ء میں انگریزوں نے اسے باآسانی فتح کر لیا اور 1843ء میں جب چارلس نیپئیر نے سندھ کو مکمل طور پر فتح کر لیا تو سندھ کا الحاق بمبئی پریذیڈنسی کے ساتھ کر دیا گیا۔ یہ شہر جلد ہی جہاز رانی اور تجارت کا مرکز بن گیا۔

1857ء کی جنگِ آزادی میں کراچی ہی میں موجودہ انفنٹری فوج کے مقامی یونٹوں نے باغیوں

کے ساتھ اپنی وفاداری کا اعلان کیا لیکن 10 ستمبر 1857ء میں انگریزوں نے کراچی کا کنٹرول سنبھال لیا۔

1864ء میں ٹیلی گرام اور 1876ء میں ریل گاڑی کی صورت میں اس شہر نے قدامت سے جدیدیت کی طرف قدم بڑھایا اور سماجیات میں ایک انقلاب کی طرف گامزن ہوا۔

1899ء میں کراچی مشرق میں گندم برآمد کرنے والا سب سے بڑا شہر بن گیا اور 1914ء میں برطانوی سلطنت کی گندم برآمد کرنے والی سب سے بڑی بندرگاہ کہلایا۔

1941ء میں کراچی کی آبادی 4,35,887 نفوس پر مشتمل تھی اور 1947ء کے بعد مہاجرین کی آمد سے بڑھ کر 10 لاکھ اڑسٹھ ہزار سے زائد ہوگئی یعنی موجود آبادی سے زیادہ مہاجرین اس شہر میں آئے اور اس شہر نے اپنا تہذیبی رُخ بدلا۔ آج کراچی 2007ء میں ایک کروڑ 45 لاکھ سے زائد آبادی والا ایک بین الاقوامی تجارتی مرکز ہے۔

اس طویل پرولوگ (Prologue۔تمہید) کا مقصد یہ تھا کہ وحید احمد کا کراچی کا نام لے کر نظم کا آغاز کرنا اس بات پر مہرِ تصدیق ثبت کرنا ہے کہ یہ شہر تاریخ، تمدن، معیشت اور جدیدیت کی طرف سفر کرتے ہوئے ایک بین الاقوامی معاشرے کی علامت ہے کہ جس کے نقشِ قدم پر ہمارے دوسرے شہر چلے جا رہے ہیں۔

یہاں پر ابنِ خلدون کا حوالہ بھی برمحل ہوگا۔ وہ اپنے مشہور مقدمہ تاریخ میں لکھتا ہے کہ ''علوم اُنہی شہروں سے مخصوص ہیں جہاں بھرپور تمدن پایا جاتا ہے۔'' [1]

اس مقام پر میں یہ بات زور دے کر کہوں گا کہ شاعر کا یہ مقام نہیں کہ وہ ہر بات کی تفصیل بیان کرے شاعر کا کام Tip of the iceberg کی طرف محض اشارہ کرنا ہوتا ہے حقیقتِ حال کو لوگ خود ہی جان لیتے ہیں۔

''کیماڑی کا گھنا پتھریلا ساحل
مچھلیوں کے حصوں بخروں
تیل کی گہری لزوجت
اور سارے شہر کی میلی کثافت کو بلو کر
سانو لا محلول پیدا کر رہا تھا۔''

موجودہ صورتِ حال کو الفاظ کا جامہ پہنا کر تاریخ کا حصہ بناتے ہوئے وحید احمد خبردار کرتا ہے کہ اندھا دھند صنعتی ترقی سے اور حفاظتی اقدامات نہ ہونے کی وجہ سے آبی آلودگی بڑھتی جا رہی ہے جس کی وجہ سے آبی مخلوق اور مچھلیاں مرتی جا رہی ہیں وہ یوں کہ تیل کی زیادہ لزوجت (Viscosity)

کی وجہ سے آکسیجن سمندری پانی میں حل نہیں ہو پاتی اور مچھلیاں سانس نہیں لے پاتیں اور اُن کی موت واقع ہو جاتی ہے۔

انسانوں کی زندگی مسائل و مصائب کے بیان سے پہلے سمندری جانداروں کو لاحق خطرات کی طرف توجہ دلانا شاعر کے حساس ہونے کی دلیل ہے اور وحید احمد نسلِ انسانی کی بقا کے لئے صاف شفاف ماحول کو شرطِ اول قرار دیتا ہے۔

''منوڑہ پر معلق نور مینارۂ عمل میں تھا''

نور مینارہ انگریزی کے لائٹ ہاؤس (Light House) کا خوبصورت ترجمہ ہے۔ یہ نور مینارہ چراغِ رہبان یا مصباح الرہبان کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ پرانے زمانے میں یہودی/عیسائی راہب رات کے وقت اپنے صومعے یا گرجے میں کسی بلند مقام پر چراغ جلا کر رکھ دیتے تھے تا کہ بھولے بھٹکے مسافروں کو بستی کا راستہ معلوم ہو سکے۔

وحید احمد کہتا ہے کہ کوئی آئے نہ آئے، کوئی ہدایت قبول کرے یا نہ کرے نور مینارہ، مصباح الرہبان اور یقیناً اس علامت سے مراد شاعر خود کو لیتا ہے کہ اُسے اپنے لوگوں کی فکری رہنمائی کرتے رہنا چاہیے۔

''ذرا دور اک ویران مندر کا بدن تھا
اور اُس کے سر پر کالی کی ہتھیلی تھی
صلیبیں تن پہ چپکائے ہوئے گرجا کھڑا تھا
اور اُس کے گرد مریم کا ہیولا تھا
مزار اتنی اگر بتیوں میں بھیگا تھا
کہ خوشبو ساحلی پانی کے اوپر تیرتی تھی''

ان لائنوں میں مذہبی اداروں کے غیر فعال ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وحید احمد بین السطور بڑی خوبصورتی سے کہتا ہے کہ مذاہب عالم کا انسان کے مصائب و آلام اور مسائل کی طرف سے صرفِ نظر کرنا ہی انسانوں کا مذاہب سے دوری اور اجنبیت کا سبب ہے۔

مندر کے ویران ہونے سے یہ حقیقت برملا بیان کرتا ہے کہ مذہبی عمارات چاہیے صومعہ ہو، چاہے گرجا، مندر یا مسجد انسانوں کے دم قدم سے ہی آباد ہیں اور اگر مندر پر کالی کا ہاتھ ہو جو تباہی کی علامت ہے تو اُس کی آبادی کے کم امکانات ہیں۔

اسی طرح گرجا کا ظلم کے خلاف مدافعت نہ کرنے کا رویہ کمزوروں اور ضعیفوں کے لئے مزید

کمزوری کا سبب بنا ہے۔

مزار، اگربتی اور تیز خوشبو انفعالیت کا استعارہ ہیں اور تصوف کے ادارے کے بے اثر اور مردہ ہونے کی علامت کے طور پر بیان ہوا ہے کہ پہلے یہاں صوفیائے کرام نے عام اور غریب لوگوں کو عزتِ نفس دی اور بھوکوں کو کھانا کھلایا لیکن اب خانقاہیں غریب آدمی کے دکھوں کا مداوا کرنے کے بجائے اُس کی جیب میں آخری سکّے پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔

''مچھیرے مچھلیاں تھے
اور اُن کے گرد خوابوں سے بھری نیندوں
گہرا جال کستا تھا
سمگلر اپنا دھندہ ختم کر کے مشرقِ وسطیٰ کی جانب
جا رہے تھے''

شاعر وحید احمد کے اندر کا معیشت دان اپنی رائے دیتا ہے کہ کسی ملک کی معیشت کے لئے سمگلنگ ناسور کا درجہ رکھتی ہے متوازی معیشت جہاں حکومت کی کمزوری کا سبب بنتی ہے وہاں دولت کا غلط ہاتھوں میں مرتکز ہو جانا معاشرے کے زوال کا سبب بنتا ہے اور ملکی دولت کے سرحدوں کے پار چلے جانا مکمل تباہی کی طرف پہلا قدم ہے۔

اکاؤنٹس کے شعبے سے وابستہ ہونے کے سبب حاصل ہونے والے شعور کی بنیاد پر وحید احمد اعلانیہ کہتا ہے کہ ملکی وسائل کے مسلسل ضیاع (Constnt pilferage of funds) سے معیشت کا ٹائی ٹینک (Titanic) ڈوب سکتا ہے۔ اس حقیقت کا علامتی اظہار اس مصرعے میں یوں کرتا ہے۔

''دھنسے مردہ جہازوں کے سیہ ڈھانچے مسلسل عالمِ برزخ میں زندہ تھے۔''

اَلبَــرزُخ کا لفظی مطلب ہے دو چیزوں کے درمیان کی روک، 2۔ مرنے کے وقت سے دوبارہ اٹھنے تک کا زمانہ، 3۔ شک اور یقین کے درمیان کی حالت۔[2]

برزخ کا تصور یہودی اور عیسائی تکونیات میں کہیں نہیں ملتا یہ خالص اسلامی الٰہیات کا تصور ہے اور تیرھویں صدی کے اطالوی شاعر دانتے نے اپنی طویل نظم ڈیوائن کامیڈی میں برزخ (Purgatory) کا تصور معراج نامے سے لیا ہے۔[3] ابنِ عربی کا اثر بھی دانتے کے ہاں با آسانی تلاش کیا جا سکتا ہے۔)

''سلیٹی مسجدوں کے چونکھی اسپیکروں میں
جب گجر دم فجر گونجی

تو سمندر نے سرکتے ساحلی تکیے پہ کروٹ پھیر کر
تاروں کے چادر تان لی
سورج ابھی کچھ دور تھا
لیکن کسی بے نام سے تیزاب سے
کچی سیاہی کٹ رہی تھی۔''

پہلی دو لائنوں میں وحید احمد نے بڑی خوبصورتی سے لحۂ موجود کی ایک بوالعجبی (Ironie) کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ماضی قریب کا واقعہ ہے کہ ہمارے علماء لاؤڈ سپیکر پر اذان اور نماز کو ناجائز سمجھتے تھے اور اسے شیطانی عمل گردانتے تھے لیکن اسی لاؤڈ سپیکر کو آج ہر فرقے کی مسجد میں جزوِ اسلام بلکہ عینِ اسلام سمجھا جاتا ہے۔ اس مسئلے کی شدت کو واضح کرنے کے لیے بڑی چالاکی کے ساتھ ''چومُکھی'' کا لفظ استعمال کیا ہے یعنی اس کا شور و شر چار سمتوں میں ہے کسی طرف کوئی جائے امان نہیں۔ اس لفظ کا حالتِ جنگ پر بھی اطلاق ہوسکتا ہے اور اس رویے کی غمازی کرتا ہے کہ اہلِ محراب و منبر ہر حال میں اور ہر قیمت پر لوگوں کو اپنا مقتدی اور ہم نوا بنا کر چھوڑیں گے چاہے اس عمل میں لوگ بہرے ہی کیوں نہ ہو جائیں۔

ڈاکٹر وحید احمد اس علامت کے پردے میں خبردار کرتا ہے کہ یہ بے ہنگم شور اگر 70 ڈیسی بیل سے زیادہ ہو جائے تو انسانی صحت پر اس کے مضر اثرات پڑنا شروع ہو جاتے ہیں جن میں چڑچڑا پن، اشتعال انگیزی، کانوں کا بجنا (Tinnitis) اور بلند فشار خون یعنی ہائی بلڈ پریشر شامل ہیں۔ یعنی 70 ڈیسی بیل (شور کی اکائی) پر بلڈ پریشر پانچ سے دس درجے بڑھ جاتا ہے۔ آج ہمیں لوگوں کے چہروں پر جو کم کم مسکراہٹ دکھائی دیتی ہے تو اس کی ایک اہم وجہ ناقابلِ برداشت شور ہے۔

مہذب ممالک میں شور کی سطح کو کم سے کم رکھنے کے لیے مختلف قوانین بنائے جا رہے ہیں اور انہیں قانون کی روح کے مطابق نافذ بھی کیا جا رہا ہے مثلاً بہت سے شہروں میں طیاروں کی رات کے وقت لینڈنگ ممنوع ہے میلبرن، آسٹریلیا میں مصروف شاہراہوں پر ساؤنڈ ٹیوب (Sound tubes) بنائی جا رہی ہیں نیو یارک اور شکاگو میں پولیس کو بلند آواز میں میوزک والی گاڑیوں کو چالان کرنے، روکنے اور ضبط کرنے کا بھی اختیار مل گیا ہے لیکن ہم لوگ ہر طرح کے شور مچانا کوئی عیب ہی نہیں سمجھتے۔ کسی مسجد کے پڑوسی سے جدید اسلام کے فیوض و برکات کے بارے میں پوچھیے۔

کیا یہ لحۂ فکریہ نہیں کہ آج کوئی شخص کسی مسجد کے قریب گھر لینا پسند نہیں کرتا۔ یہ جملہ اگر سخت ہے تو اس بات پر بھی غور کیجیے کہ جو مکانات مسجد کے قریب ہوتے ہیں اُن کی قیمت دوسرے مکانوں کے مقابلے میں کم کیوں ہوتی ہے؟ اور تو اور یہ چیختے دھاڑتے چومکھی سپیکر ہمارے فوجی رہائشی علاقوں

(کنٹونمنٹ ایریاز) اور ڈیفنس میں کیوں نہیں ہوتے؟ کیا وہ لوگ قربِ الٰہی کے منصب پر فائز ہو چکے ہیں؟ کیا عام بستیوں میں رہنے والے نعوذ باللہ مرتد ہو چکے ہیں کہ دن رات انہیں واپس ''اسلام'' کے راستے پر لانے کی بلند آہنگ صوتی جنگ جاری ہے؟

دیکھئے شاعر صرف ایک لفظ صحیح جگہ پر استعمال کر کے کتنی حقیقتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔[۴]

''سورج ابھی کچھ دور تھا
لیکن کسی بے نام سے تیزاب سے
کچی سیاہی کٹ رہی تھی''

بھئی کیا شاعرانہ تخیل ہے ان لائنوں کی صرف داد دی جاسکتی ہے۔

اگلے منظر میں وحید احمد دکھاتا ہے کہ ایک قدیم طرز کی بادبانی کشتی کراچی کے ساحل پر آ کر رکتی ہے جس میں سقراط سوار ہے۔

سقراط وحید احمد کے ہاں علم اور دانش کی علامت کے طور پر آیا ہے اور اسی نظم میں آگے چل کر یہ کہا گیا کہ علم دانش اور فلسفہ پر کوئی بھی بات ہو سقراط کے تذکر کے بغیر ناممکن ہے۔

سقراط (470ق م۔ 399ق م) نے اپنی کوئی تحریر نہیں چھپوائی۔ وہ گھوم پھر کر ایتھنز کے شہریوں کو تعلیم دیتا تھا اور تعلیم پر اُجرت لینے کے سخت خلاف تھا۔ سقراط کی تعلیمات پلوٹو (افلاطون) کے مکالمات، ارسٹوفینز کے ڈراموں اور زینوفان کے مکالمات میں ملتی ہیں۔

ایک سوال کے جواب میں ڈیلفی کے معبد کی ایک کہانت / دیوبانی میں بتایا گیا کہ سقراط سے عقلمند کوئی نہیں تھا۔ وہ اچھائی، خوبصورتی اور نیکی کی روح کو سمجھتا تھا۔

ماضی قریب میں جدید محققین میں مرزا طاہر احمد قادیانی نے سقراط کے انکشافات کو درجۂ پیغمبری میں رکھا ہے۔[۵] سقراط کا استعارہ اس لیے بھی لایا گیا کہ صدیوں پرانے اعتقادات کو بدلنے کے لیے سقراط جیسی دانش کی ضرورت ہے اور کسی معاشرے میں راسخ عقائد کو بدلنا خطرناک کام ہوتا ہے جیسے کہ سقراط کو سچائی کا علم بردار ہونے کے باوجود زہر کا پیالہ پینا پڑا۔ آج سقراط کو سزا دینے والوں کے نام تک کسی کو معلوم نہیں لیکن علم و دانش کا ہر تذکرہ سقراط سے شروع ہوتا ہے۔

''جب اُس کے پاؤں ساحل پر پڑے
۔۔۔۔(سے لے کر)
اور باہر کسی جگہ پر رابطہ ہے۔''

اس کھیٹو میں وحید احمد نے کچھ معاشرتی برائیوں کی طرف اشارہ کیا ہے کہ سرکاری حکام کا

درشت رویہ اور توہین آمیز سلوک، اصحابِ علم وفن کو حقیر سمجھنا دراصل علم وفن کی تحقیر ہے اور جو قوم علم کی توہین کرتی ہے اُسے تباہ ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

ایک اور سماجی بوالعجبی (Ironie) دیکھئے کہ اگر ''چوہدری سقراط چیمہ'' لکھا جائے تو کتنا مضحکہ خیز لگتا ہے یعنی پروفیشنلز کا اپنے نام کیساتھ ذات پات کا سابقہ لاحقہ لگانا ایک غیر علمی رویہ ہے مثلاً اگر کوئی نیوکلیر انجینئر ہے اور وہ اپنا نام یوں لکھے، انجینئر چوہدری الف ب چنگڑ تو کتنا مضحکہ خیز لگتا ہے۔ اس طرح اصحابِ دانش کے سامان میں چرس اور ہیروئین تلاش کرنا بھی ایک طنز کی ذیل میں آتا ہے۔

بظاہر یہ طنز یہ مصرعے لگتے ہیں لیکن یہ ایک اور خوفناک حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ ہمارے ملک سے خاص کر مغربی ممالک میں جانے والے مسافروں کے سامان میں منشیات کی موجودگی کا شبہ کیوں کیا جاتا ہے اور اس میں ان پڑھ اور تعلیم یافتہ کی کوئی تخصیص نہیں رکھی جاتی اور تو اور برادر مسلمان ممالک بھی ہماری پوٹلی کو مشکوک نظر سے دیکھتے ہیں:

نیم خواندہ سپاہی سقراط سے کہتا ہے:

''سچ بتادے

ورنہ تیری کھال کا جوتا بنا کر میں کراچی شہر

ناپوں گا''

اس مصرعے میں وحید احمد جہاں سرکاری عمال کے عوام کے ساتھ ظالمانہ برتاؤ کی طرف اشارہ کرتا ہے وہاں اس امر کی طرف بھی توجہ دلاتا ہے کہ ایک زبان کا محاورہ دوسری زبان میں ترجمہ ہو کر اپنی اصل روح کھو بیٹھتا ہے وارث شاہ اپنی ہیر میں ایک جگہ کہتا ہے،

''ساڈے چم دیاں جُتیاں کرے کوئی۔۔۔''

یہ عشق، فنا، مکمل خود سپردگی اور محبوب کے سامنے راضی بہ رضا ہونے کا استعارہ دوسری زبان میں ترجمہ ہو کر ظلم اور جبر کی علامت بن گیا ہے۔

آگے چل کر وحید احمد طنزاً کہتا ہے کہ دنیا میں جرائم کے اقبال کے لیے جدید ذرائع بروئے کار لائے جارہے مختلف ادویات مثلاً Ketamine تحقیق وتفتیش میں استعمال ہورہی ہیں۔[6]

لیکن ہمارے تھانوں میں تھرڈ ڈگری تشدد جاری وساری ہے جس سے گزرنے والا کوئی شخص نارمل زندگی نہیں گزار سکتا۔

میرے نزدیک نظم کا مرکزی نیوکلیئس ''فلسفی بادشاہ'' کا تصور ہے جسے وحید احمد حرزِ جان بنائے ہوئے ہے یعنی امورِ مملکت کا فلاسفہ کا تابع ہونا ہے یہ وہ خواب ہے جسے ہر باشعور شخص دیکھتا ہے

لیکن صورت حال یہ ہے کہ ہر شخص اپنا کام اپنا فرضِ منصبی چھوڑ کر دوسرے شعبوں کی ذمہ داریوں کی تگ ودو میں مصروف دکھائی دیتا ہے۔ ایسے میں وحید احمد صاحب مشورہ دیتا ہے کہ تقسیم کار کے اصول کے مطابق اگر ہر شخص، ہر ادارہ اپنا کام کرے اور دوسروں کو اپنا کام کرنے دے تو مملکت کا سفینہ کبھی شکست وریخت کا شکار نہیں ہو سکتا۔

''پروفیسر!
مری اس پوٹلی میں وقت کے ٹکڑے ہیں
لمحوں کا بُرادہ ہے۔۔۔
۔۔۔اور جو ہونا ہے، اس میں ہے۔''

ان لائنوں میں سقراط کی زبانی وحید احمد اپنے جدید تاریخی شعور کا اعلان کرتا نظر آتا ہے کہ تاریخ ایک تسلسل کا نام ہے اور زمانے کی مصروف تقسیم ماضی حال اور مستقبل میں حال کا کوئی مطلق وجود نہیں ایک سیکنڈ کو نو سیکنڈ تک تقسیم کر لیا گیا ہے (ایک سیکنڈ کے ایک اربویں حصے تک) اور وقت اتنی برق رفتاری سے گزر رہا ہے یا مستقبل اتنی تیزی سے ماضی میں تبدیل ہو رہا ہے کہ جب آنے والا پل ہمارے سامنے آئے گا تو اس قدر تیزی سے گزر جائے گا کہ ہمیں اس کا ادراک ہی نہ ہو سکے گا۔

سو کہنا یہ ہے کہ جو کچھ ہے وہ ماضی ہے اور مستقبل کے لمحے نے ابھی آنا ہے اور جب وہ آئے گا وہ ہمیں خبر ہونے سے پہلے ہی گزر چکا ہوگا اور ماضی میں بھی تاریخ صرف وہی واقعات بنتے ہیں کہ جو ضابطہ تحریر میں آجائیں اور تاریخ کا درست اور سچائی سے تحریر کیا جانا سب کے لئے بھلائی ہے وگرنہ تاریخ مؤرخوں کے ہاتھ میں وہ ہتھیار بن جاتی ہے جس کا زہر صدیوں اور نسلوں تک برقرار رہتا ہے اور معصوم ذہنوں کو مسموم کرتا رہتا ہے۔ اس حقیقت کا اشارہ ان لائنوں میں ملتا ہے

''یہ وقت کے ٹکڑے یہ لمحوں کا برادہ
بھربھرے، بیکار، دقیانوس وقتوں کے جلے
لفظوں کی میلی راکھ ہے
اور آپ اس کو ساتھ والے ملک میں جا کر
اسی سہ پہر گنگا میں بہا دیں۔''

پڑوسی ملک کی اصطلاح اُس مستقل آویزش کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ ہم اپنے ہمسائیوں کا نام بھی اپنی زبان سے ادا کرنا گوارہ نہیں کرتے اور علم ودانش کے چمکتے ہوئے الفاظ کو راکھ سمجھ کر گنگا میں بہادینے کا مشورہ دیتے ہیں۔

''دُعائیں دیجیے افلاطون کو
یا فوجی زینوفان کو
جو آپ کو لفظوں میں لے آئے
وگرنہ آپ بھی اس پوٹلی کی راکھ میں ہوتے۔''

ان لائنوں میں اس تاریخی حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اگرچہ سقراط نے اپنی کوئی تحریر کردہ کتاب نہیں چھوڑی لیکن وہ زبانی روایت (Oral Tradition) سے علم تقسیم کیا کرتا تھا اور اُس کے تعلیمات کو اُس کے شاگردوں میں پلوٹو (افلاطون)، ارسٹوفنیز اور زینوفان نے اپنی کتابوں میں درج کیا اور یہ دانش ہم تک پہنچی۔

ان لائنوں میں وحید احمد تاریخ کے بارے میں جدید شعور کا برملا اعلان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تاریخ نہ صرف ماضی کے حالات و واقعات کے مجموعے کا نام ہے بلکہ لمحۂ موجود اور مستقبل بھی History to be کی صورت میں تاریخ کے دامن میں سمٹ جائیں گے۔ ماضی کے بارے میں ہم وہی کچھ جانتے ہیں کہ جو لکھا گیا اور تاریخ شخصی حوالوں کے بغیر کوئی معنی نہیں رکھتی۔ (۷)

''پروفیسر
مری اس پوٹلی میں عہد نامہ ہے
پرانا عہد نامہ بھی، جو کوہِ طور پر اترا
نیا بھی
جس کے حرف وصوت کو انجیل کہتے ہیں
مری اس پوٹلی کو اہلِ دل زنبیل کہتے ہیں
کہ اس میں وید کے اشلوک ہیں
زرتشت کا بن باس ہے
بدھا کا پنجر ہے
تمہاری دھڑکنوں میں گونجتا ایمان ہے
قرآن ہے۔''

اس کھیڈو میں وحید احمد آسمانی صحائف کو علم اور دانش کو منابع قرار دیتے ہوئے کہتا ہے کہ جس طرح علم و دانش ایک مسلسل رویے اور عمل کا نام ہے اُسی طرح تمام مذاہب تقویمی ترتیب (Chronological order) میں ماقبل کی تائید و تصدیق کرتے ہیں آسمانی صحائف نے لوگوں کو

(ثواب اور عذاب کے نقطۂ نظر سے ہی سہی) حرف شناسی اور لکھنے پڑھنے کی طرف مائل کیا۔ یوں سمجھئے کہ بچہ جب تک پاؤں پاؤں چلنا نہیں سیکھتا وہ جھولے میں ہی پڑا رہتا ہے لیکن جب اُسے پاؤں لگ جاتے وہ دوڑتے بھاگتے کسی طرف بھی نکل سکتا ہے۔ سو انسانی فکر کی تعمیر میں مذاہب کے کردار کو وحید احمد تسلیم کرتا ہے لیکن وسیع تر تناظر میں اسے ناکافی سمجھتے ہوئے کائنات کو کلّیت کے حوالے سے دیکھنے کا مطالبہ کرتا ہے۔

''سقراط جی۔۔۔
۔۔۔فلسفے کی بات چھیلے
اور وہ سقراط سے محروم رہ جائے۔''

ان لائنوں میں وحید احمد بتاتا ہے کہ فلاسفر کون ہوتے یعنی علم اور دانش سے محبت کرنے والے، ٹھنڈے لب و لہجے میں حریف کی بات سننے والے اور منطق، دلائل و براہین سے کام لینے والے ہیں۔ علم ایک سمندر ہے علم کا راستہ پوری زندگی پر محیط ہے، علم جزو سے محبت کرتا ہے اور کُل کی تعظیم کرتا ہے۔

''سقراط جی
ہم گفتگو کو موڑ دیتے ہیں
زمانہ تیز رفتاری سے بڑھ کر برق رفتاری کی
زد میں ہے
پرانے دور کے اسپارٹا، ایتھنز ہجرت کرکے
واشنگٹن ہوئے ہیں، ٹوکیو کہلائے جاتے ہیں
چنانچہ سوچ کا دھارا بدلتا جارہا ہے۔''

ایتھینا دیوی (Athena) کے نام پر بننے والا شہر جو کم از کم تین ہزار سالہ لکھی ہوئی تاریخ رکھتا ہے۔ قدیم زمانے میں یہ شہر طاقت کی علامت علم و دانش کا گہوارہ، فنون، فلسفہ، افلاطون کی اکیڈمی اور ارسطو کے لائسیئم (Lyceum بمعنی مدرسہ) کی شاندار روایت رکھنے والا شہر آج صرف موسیقی اور ہم جنس پرستی کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے۔[۸]

جب ایتھنز پر زوال آیا تو دسویں صدی قبل مسیح کے آباد کردہ شہر سپارٹا کی طرف طاقت کا توازن منتقل ہونے لگا۔

وحید احمد بتاتا ہے کہ طاقت اور استعمار کا اپنا فلسفہ ہوتا ہے اور آج کے تناظر میں واشنگٹن اور

ٹوکیو کو مغرب اور مشرق کی علامت کے طور پر پیش کرتا ہے۔ واشنگٹن شہر کی تعمیر کے لیے 1790ء میں امریکی صدر جارج واشنگٹن نے دریائے پوٹوماک کے کنارے کا انتخاب کیا۔ کسے معلوم تھا کہ 13 اکتوبر 1792ء کو جب امریکہ کی دریافت کی تین سو سالہ سالگرہ کے موقع پر قصرِ ابیض (White house) کا سنگِ بنیاد رکھا جا رہا تھا یہ قصر ابیض آئندہ چل کر عالمی طاقت کی علامت بنے گا اور ماضی کے ایتھنز کو قصۂ پارینہ بنا دے گا۔(۹)

اسی طرح 1603ء میں ٹوکیو کو دارالحکومت کا درجہ ملا 1923 میں زلزلے اور 1942ء میں جنگِ عظیم کے دوران تباہ ہونے والا شہر آج خود انحصاری اور معاشی ترقی کی علامت ہے۔(۱۰)

ان سطور میں وحید احمد بڑی دردمندی سے یہ پیغام دیتا ہوا دکھائی دیتا ہے کہ خود انحصاری اور معاشی خود مختاری کے بغیر اقوامِ عالم میں کوئی قابلِ ذکر مقام حاصل کرنا نرم سے نرم الفاظ میں دیوانے کا خواب قرار دیا جا سکتا ہے اور اسی حقیقت کو شاعرِ مشرق نے بہت پہلے یوں بیان کیا تھا،

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

''شعوری لاشعوری اور سب تحت الشعوری۔۔۔
تو یہ جو آپ کے اندر اُچھلتا چھل سمندر ہے
چھنا کے سے اڑے۔۔۔ بادل میں ڈھل جائے۔''

نظم کے اِس حصے میں ایک اور عدم توازن کی طرف اشارہ ہے کہ ایک طرف بیماریوں پر قابو پایا جا رہا ہے اور کلوننگ کی کامیابیاں حاصل کی جا رہی ہیں (کلوننگ یونانی لفظ سے نکلا ہے جس کا مطلب ہے Twig یعنی قلم/شاخ سے پودا بنانا بغیر بیج کے) کائنات کے دور دراز گوشوں تک رسائی کی کوششیں ہو رہی ہیں لیکن وحید احمد خبردار کرتا ہے کہ آج انسانیت کے لئے سب سے بڑا خطرہ جوہری ہتھیار ہیں۔ جوہری ہتھیاروں کو عام بندوق اور توپ کی طرح کا کوئی ہتھیار سمجھتے ہوئے ان سے اغماض برتنا اصحابِ فکر و دانش کا قبیح ترین جرم سمجھا جائے گا۔

(خاکم بدہن) جوہری جنگ کی صورت میں کیا ہوگا اس بارے میں ذرا بھی شعور نہیں پایا جاتا۔ سٹین فورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر پال ارلک (Prof. Paul Ehrlic) خبردار کرتے ہیں کہ (جوہری جنگ) میں جیتنے والا کوئی نہ بچے گا۔

100 میگا ٹن کے دھماکے (جو رُوسی اور امریکی جوہری اسلحے کا محض ایک فیصد ہے) سے اتنا گرد و غبار اُٹھے گا جو 99% یا اس سے زیادہ سورج کی روشنی کو ہفتوں تک زمین پر پہنچنے سے روک دے گا۔

اگر پانچ ہزار سے دس ہزار میگا ٹن کا دھماکہ ہوا تو عالمی سطح پر بلیک آؤٹ ہو جائے گا کیونکہ گردوغبار کے بادل سورج کی شعاعوں کو زمین پر پہنچنے سے روک دیں گے، جب زیریں احمر (Infra red) شعاعیں زمین پر نہیں پہنچیں گی (جو زمین پر گرمی کا سبب بنتی ہیں) تو چند ہفتوں کے دوران درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے نیچے گر جائے گا۔ جون جولائی کے مہینے میں بھی تین ہفتوں کے اندر درجہ حرارت صفر سے نیچے چلا جائے گا۔

انسانوں کی اکثریت فوری طور پر ہلاک ہو جائے گی دور دراز کے رہنے والے انسان بھوک اور پیاس سے مر جائیں گے کیونکہ تمام دریا، ندیاں اور جھیلیں جم جائیں گی۔ کھڑی فصلیں جل جائیں گی اور شمالی علاقوں میں بچ جانے والی فصلیں درجۂ حرارت گرنے سے تباہ ہو جائیں گی کیونکہ روشنی کے نہ ہونے سے ضیائی تالیف (Photosynthesis) کا عمل پودوں میں شروع نہ ہو سکے گا۔ انسان اور جانور خوراک نہ ہونے کی وجہ سے فاقوں مر جائیں گے۔

پروفیسر موصوف سوال اٹھاتے ہیں کہ پودے تو چلو پھر بھی امکان ہے کہ بیجوں سے دوبارہ نکل آئیں گے لیکن جانور اور انسان دوبارہ کیسے پیدا ہوں گے؟ اور اگر پانی تمام پائپوں میں جم جائے تو پانی کے حصول کے لئے دریا یا ندی تک پہنچنا کتنا دشوار ہوگا؟ کتنی پیاس ہوگی؟[11]

مکرر عرض ہے کہ شاعر کا کام Tip of the iceberg کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ اسی طرح اگلے مصرعے میں وحید احمد عہدِ حاضر کے ایک اور خطرے ''سرد جنگ'' کی طرف توجہ مبذول کرواتا ہے۔ یہ ترکیب، ''سرد جنگ'' کیا ہے؟ اس کی تفصیلات جاننے کے لیے سیمؤل پی ہٹنگٹن کی کتاب ''تہذیبوں کا تصادم''

(Clash of Civilizations by - Sameul P Hutington)

پر ایک اجمالی نظر ڈالنی ہوگی اس کتاب میں جو بنیادی نظریہ پیش کیا گیا ہے کہ سرد جنگ کے بعد کی دنیا میں لوگوں کے ثقافتی اور مذہبی شعار (Cultural & religious / identities) اختلافات کی بنیادی وجہ بنیں گے۔

یہ نظریہ 1992ء میں چھپنے والی فرانسس فوکیویاما کی کتاب ''تاریخ کا اختتام اور آخری آدمی'' (The End of History & The Last Man) کے ردِ عمل کے طور پر چھپنے والے امورِ خارجہ کے ایک مضمون میں سامنے آیا جسے بعد ازاں ہٹنگٹن نے اس نظریے کی توسیع کی اور کتاب کا پورا نام ہے

(Clash of Civilizations Remaking Of World Order)

یہ ترکیب 'تہذیبوں کا تصادم' سب سے پہلے 1990ء میں برنارڈ لیوس (Bernard Lewis)

کے ایک مضمون میں استعمال ہوئی جو ماہانہ اٹلانٹک کے شمارہ ستمبر 1990ء میں بعنوان ''مسلمانوں کے غیظ وغضب کے اسباب(The Roots of Muslim Rage) سے چھپا۔

ہٹنگٹن اس کتاب میں رقم طراز ہے کہ مغرب کا اپنی اقدار پر مسلسل زور دینا اور باقی تمام ملکوں میں بزورِقوت رائج کرنا دوسری تہذیبوں میں اشتعال انگیزی پیدا کرے گا۔چین عالمِ اسلام کا فطری اتحادی ہوگا،چین کا اقتصادی عروج مغرب کے لیے طویل مدتی خطرہ ہوگا۔وغیرہ وغیرہ

ان معروضات سے وحید احمد کا عصری شعور اور عالمی سیاسی وسماجی معاملات سے وسیع تر آگاہی کھل کر سامنے آتی ہے اور بجاطور پر اپنے لوگوں کے شعور کو بلند تر سطح پر لاتا ہوا نظر آتا ہے۔

اسی کمیٹو میں یہ لائنیں غور طلب ہیں

''موسموں کے ساتھ سکّوں کے بدلتے
رنگ، بنکاری
مرکب سود جس کی بھیڑ میں انسان مفرد ہو
کے رہ جائے۔''

معاشیات اور حساب داری کا گہرا شعور ان سطروں سے جھلکتا نظر آتا ہے۔ بینکاری اور مرکب سود کے معاشرے اور سماجیات پر کیا اثرات پڑے اور آئندہ زندگی کا پنجۂ معاش سے باہر تصور، گہری بصیرت اور وسیع علم کا متقاضی ہے اور یقیناً ناچیز کی معلومات اس بارے میں محدود ہیں لہذا میری خواہش ہوگی کہ اکاؤنٹس اور بینکاری سے تعلق رکھنے والے نمایاں ادیب شاعر مثلاً منیر سیفی، اظہار الحق، حسین مجروح، فرخ یار، محسن شکیل اور ڈاکٹر عائشہ صدیقہ اس پہلو پر تفصیلی روشنی ڈالیں۔

مرکبِ سود کے سلسلے میں صرف ایک مثال پیش کروں گا کہ اگر 1626ء امریکی قبائل نے مین ہٹن (Manhatten) کی فروخت کے عوض 60 گلڈر حاصل کیے ہوتے اور اس سرمائے کو 6.5% سالانہ کے سود پر کسی ڈچ بنک میں جمع کروا دیا ہوتا تو 2005ء میں کیے گئے ایک حساب کے مطابق یہ رقم 700 بلین یورو بن جاتی اور آج اس رقم سے نیویارک کے پانچوں بورگ (Bourghs) خریدے جاسکتے تھے۔[۱۲]

ان سطروں میں بین السطور یہ پیغام ملتا ہے کہ آج کا نظامِ زرقدرزائد کے اصولوں کے مطابق استحصال پر مبنی ہے اور دولت مندوں کی دولت میں مسلسل اضافہ ہوتا جارہا ہے اور غریب، غریب سے غریب تر اور خطِ افلاس سے مسلسل نیچے گرتے جارہے ہیں۔[۱۳]

''پروفیسر

وہی انسان ہے جو تھا
وہی آنکھیں، وہی چہرہ
وہی پنجر پہ لپٹا ماس، جنبش کھینچتا، چلتا
وہی شریان در شریان ٹھاٹھیں مارتا گہرا لہو
صدیوں نے جس کا رنگ نہ بدلا''

ڈاکٹر وحید احمد تمام انسانوں میں اناٹومی (Anatomy) کو قدرِ مشترک قرار دیتا ہے اور باقی سب امور کو فروعی گردانتا ہے دنیا کے کسی ایک حصے میں ایجاد/دریافت ہونے والی دوا سے تمام انسان فائدہ اٹھا سکتے ہیں کسی ایک خطے کا سرجن دنیا کے کسی بھی انسان کا بلا تکلف آپریشن کر سکتا ہے۔ لیکن اس المیے کا اظہار بھی کرتا ہے کہ انسان ہی انسان کو ختم کرنے کے در پے ہے اور جنگ کے سامان تیار کیے چلا جا رہا ہے۔

انسان کو جنگ سے نفرت دلانے کے لئے بڑی مہارت سے ایٹمی تابکاری کے اثرات کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تابکاری نہ صرف موجود انسانوں کے لیے ایک خطرہ ہے بلکہ آنیوالی نسلیں بھی اس سے محفوظ نہیں رہ سکتیں۔ تابکاری انسانی خلیوں میں کینسر پیدا کر دیتی ہے اور DNA میں مضر تبدیلیاں لا کر اعضاء سے محرومی کا سبب بن سکتی ہے اور معذور بچوں کی پیدائش یقینی ہوتی ہے اور کوئی بھی صحیح العقل شخص کبھی نہیں چاہے گا کہ اُسے ہونے والے بیٹے، بیٹی کی ایک آنکھ نہ ہو، اس کے ہاتھوں کی انگلیاں نہ ہوں یا انہیں کوئی اور معذوری ہو لہٰذا ہر باشعور فرد جنگ کی تباہ کاریوں سے خود بھی بچے اور دوسروں کو بھی جنگی جنون میں مبتلا نہ کرے۔

''کبھی اک پوٹلی سونے کے بدلے سلطنت گروی
کہیں جب ناف کٹتی ہے
تو بچے کے گلے میں قرض کی زنجیر پڑتی ہے
کہیں بالشت جتنا ملک
اربوں ہانپتے سینوں میں سانسیں بانٹ دیتا ہے
کبھی جھٹکے سے سانسیں اس طرح سے کھینچ لیتا ہے
کہ جیسے عرش پر اُس کے سوا کوئی نہیں بیٹھا۔''

ان سطور سے وحید احمد کی قومی دردمندی جھلک رہی ہے اور
''قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند''

کی تفسیر دکھائی دے رہی ہیں۔آج ہمارا ملک 38 ارب ڈالر کا مقروض ہے اور 16 کروڑ کی آبادی کا ہر فرد اندازاً 238 ڈالر یا 14725 روپے مقروض ہے۔قرض لینے والوں نے وقتی مفادات، عاقبت نا اندیشی اور اپنے کمیشن کی خاطر ملک وقوم کو گروی رکھ ڈالا اس سے بڑا اور بھیانک جرم کوئی اور نہیں ہوسکتا۔وحید احمد ہمارے ذہنوں کو جھنجھوڑتے ہوئے کہتا ہے کہ آج جب بھی ملک میں کوئی آفت آتی ہے تو امداد کے لیے ہمیں بیرونی ممالک کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔وحید احمد بڑی دردمندی سے یہ سوال اٹھاتا ہے کہ کیا ہم ہمیشہ کے لیے دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے رہیں گے؟ معاشی خود کفالت کی منزل کب آئے گی؟ اور معاشی خود کفالت اور اپنے ذرائع کے اندر زندگی بسر کیے بغیر خود مختار مملکت کا خواب کوئی احمق ہی دیکھ سکتا ہے۔

''جنہیں تم میر جعفر، میر صادق کا لقب دشنام
کرتے ہو
بہت معصوم تھے وہ لوگ۔۔۔
ہماری بات لمبی ہو رہی ہے۔''

میر جعفر اور میر صادق کا نام ہماری قومی تاریخ میں گالی کا مترادف بن گیا ہے اُن کا جرم کیا تھا؟ انہوں نے ملک وقوم سے کیا غداری کی کہ آنے والی نسلوں نے اُن سے مسلسل نفرت کی؟

23 جون 1757ء کو کلکتہ سے 150 کلومیٹر شمال میں مرشد آباد کے قریب پلاسی کے میدان میں نواب آف بنگال سراج الدولہ کی فوجیں برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقابل تھیں۔ایسٹ انڈیا کمپنی مغل حکومت کی طرف سے جاری کردہ ٹریڈ پرمٹ (دستک۔Trade Permit) کی رو سے نواب آف بنگال کو ٹیکس دینے سے انکاری تھی۔

میر جعفر بنگالی فوج کا سپہ سالار تھا (جسے آج کی زبان میں آرمی چیف کہنا چاہیئے) اُس نے کچھ با اثر بیگمات سے مل کر سراج الدولہ کی شکست کی راہ ہموار کی جس کے صلے میں میر جعفر کو بنگال کا نواب بنا دیا گیا لیکن وہ علامتی نواب تھا اور اصل اقتدار کمپنی کے پاس تھا۔

اس جنگ کے بعد ہونے والے ایک معاہدے کے مطابق نواب آف بنگال کے خزانے سے 25 لاکھ پاؤنڈ ایسٹ انڈیا کمپنی کو بطور تاوان ادا کیے گئے اور 2 لاکھ 24 ہزار پاؤنڈ لارڈ کلائیو نے اپنی ذات کے لیے حاصل کیے (اس رقم کو اس تناظر میں دیکھئے کہ اُس دور میں ایک انگریز 800 پاؤنڈ سالانہ میں آسودہ زندگی گزار سکتا تھا۔) ایک کروڑ روپیہ بطور نقصان کمپنی کو ادا کیا گیا 50 لاکھ روپیہ کلکتہ کے انگریز متاثرین کو دلوائے گئے۔اسی طرح اور بھی ذلت آمیز شرائط مسلط کی گئیں۔

تاریخ کا یہ بھی جبر دیکھئے کہ نواب آف بنگال کی دولت فاقہ زدہ بنگالیوں کے کام نہ آئی اور اُسے اغیار لے اُڑے۔ لارڈ کلائیو نے اس دولت سے آئر لینڈ میں لمرک سٹیٹ کے نزدیک ایک جاگیر خریدی اور آج بھی اس جاگیر کے ایک حصے کا نام پلاسی (بمعنی سرخ پھول) ہے لیکن وہ بھی افیون کے نشے کی لت کا شکار ہو کر مر گیا۔ مقام عبرت ہے کہ بنگال کا خزانہ بھرا ہوا تھا (جیسے ہمارے زرمبادلہ کے ذخائر بڑھتے چلے جا رہے ہیں اور عام آدمی۔۔۔؟) لیکن ایک فرد آرمی چیف کی غداری کی وجہ سے ہندوستان کی محکومی کی ابتداء ہوئی۔(۱۴)

اس طرح ٹیپو سلطان کے وزیر میر صادق، جو خزانے کا بھی انچارج تھا، نے یہ غداری کی کہ پہلے تو فوجیوں کو تنخواہوں کی بروقت ادائیگی نہیں کی جس سے فوجیوں میں بددلی پھیل گئی ظاہر ہے کہ بھوکے پیٹ جنگ نہیں لڑی جاتی اور پھر عین لڑائی کے موقع پر اُس نے اعلان کروا دیا کہ فوجیو آؤ آ کر تنخواہ لے جاؤ۔۔۔

یہ 5 مئی 1799ء کا واقعہ ہے جب 4,500 انگریز مر چکے تھے اور لارڈ ویلز لے شکست تسلیم کرنے کی سوچ رہا تھا لیکن میر صادق نے ایک تو تنخواہوں کی ادائیگی کی چال چلی اور دوسرے یہ افواہ اُڑا دی کہ ٹیپو سلطان کو گرفتار کر لیا گیا ہے دریں اثنا ایک گولی ٹیپو سلطان کے بازو میں آ کر لگی اور ایک گولی کنپٹی پر لگی لیکن میر صادق کو میر جعفر کی طرح اپنی غداری کی قیمت وصول کرنے کی مہلت نہیں ملی، اُسے ایک وفادار نے حملہ کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا۔(۱۵)

لیکن وحید احمد کی نظر میں ان دونوں غدارانِ قوم کا شر بڑا محدود تھا اگرچہ ان دونوں کی غداری کی وجہ سے ہندوستان پر ڈیڑھ سو سال تک غلامی مسلط رہی لیکن بالآخر ہندوستان کو آزادی نصیب ہو گئی لیکن اب ان غداروں کے گھرانوں کے چشم و چراغ ہمارے ''عالمی شہرت یافتہ معاشی بزرجمہر'' قرض کی دستاویزات پر ایک دستخط سے آنے والی نسلوں کو گروی رکھ رہے ہیں اور اس غلامی سے نجات کی کوئی صورت مستقل قریب میں دکھائی نہیں دیتی اور مقامِ افسوس یہ ہے کہ قوم کو ان غداران وطن کے نام تک معلوم نہیں اور وہ معاشرے میں معزز بن کر رہ رہے ہیں۔ وحید احمد کے اندر کا حساب دار چاہتا ہے کہ اس قوم کو ان غداروں کے نام بھی درجہ بدرجہ معلوم ہوں تاکہ اس ملک کے اصل محسنین اور جعلی اشرافیہ کھل کر سامنے آئیں۔

''مختصر یوں ہے
کہ کوئی ملک دھرتی کے خزانوں میں نہائی
کوکھ سے غربت لئے پیدا نہیں ہوتا

غریب اس کو وہاں کے لوگ کرتے ہیں''

ان لائنوں میں یہ پیغام ملتا ہے کہ درست معاشی تبدیلیاں اور نیک نیتی سے بنائی جانے والی معاشی پالیسیاں ملک کو صحیح سمت میں لے جا سکتی ہیں اور مقامی وسائل سے استفادہ کیے بغیر اور لوگوں کی حالت بہتر بنائے بغیر کسی قسم کی ترقی جعلی ثابت ہوگی۔

تھرپارکر میں اگر ریت ہی ریت ہے تو وہاں ریت سے شیشہ بنانے کے کارخانے کیوں نہیں لگائے جا سکتے۔ بلوچستان میں صرف پتھر کے پہاڑ ہیں تو وہاں سنگِ مرمر اور دوسرے پتھروں کی کٹائی کے کارخانے کیوں نہیں لگ سکتے۔ صرف اٹلی کے سنگِ مرمر کی برآمد کے اعداد و شمار دیکھیں تو عقل دنگ رہ جاتی ہے آخر ہم ایسا کیوں نہیں کر سکتے لیکن اس کے لیے نیت شرطِ اول ہے جو ہمارے حکمرانوں میں دور دور تک کہیں دکھائی نہیں دیتی اور دکھائی بھی کیسے دے وہ کون سا لوگوں کے منتخب کردہ ہیں اور اگر فرضِ محال نیک نیت بھی ہوں تو کیا کر سکتے ہیں ملک کی پیداوار کا بیشتر حصہ قرض کے سود کی ادائیگی اور نام نہاد دفاع پر خرچ ہو جاتا ہے۔

''پروفیسر
کسی بھی ملک کے دانش وروں کی سوچ میں
اک بار جب غربت اتر آئے
تو صدیاں چاہئیں
اس ملک کے ماتھے پر چپکی مفلسی کی رات
دھونے کو
اگر سورج نچوڑو گے
تو اک قطرے کے آگے کچھ نہیں ہوگا
پروفیسر سیاہی کی طرح ساحل کی گیلی رات میں دھنستا
گیا
بس کانپتا چہرہ ہوا میں رہ گیا''

وحید احمد نے جہاں عام لوگوں کو حقیقتِ حال سے خبردار کیا ہے وہاں ملک کے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کے ضمیر کو بھی ٹہوکے دیے ہیں اور اس بات کا برملا اعلان کیا ہے کہ اگر ادیب شاعر اپنی ذمہ داریوں سے غافل ہو جائیں اور معاشرے کی فکری رہنمائی سے پہلوتہی کریں تو قوم قعرِ مذلت میں جا گرتی ہے اور صحیح استدلال کے سامنے ہر باطل دلیل بودی ثابت ہوتی ہے سچائی کے سامنے جھوٹ

بالآخر زمیں بوس ہو جاتا ہے۔اور اگر سوچنے سمجھنے والے دانشوروں میں فکری افلاس در آئے تو اُس معاشرے کی تباہی یقینی ہے۔

''پھر شام کو
سقراط جب واپس سمندر کی طرف بڑھنے لگا
تو جسم سارے ریت میں اترے ہوئے تھے
ہر طرف چہرے ہی چہرے تھے
صلیب اک شخص کے ہونٹوں پہ چسپاں تھی
جبیں کوئی تلک والی
کسی کے سر پر ٹوپی تھی
کسی چہرے پر داڑھی تھی
کسی کے کیس لمبے تھے
مگر بچے زمین کی کھینچ سے محفوظ تھے
وہ کھیلتے تھے
ان کی ہر گردن میں
اک زنجیر تھی جو جھنجھناتی تھی
ادھر سقراط کشتی کی طرف چہروں پر چلتا جا رہا تھا
ادھر بچے اُسے آواز دیتے تھے
ہمیں معلوم ہے بابا
مرمت کون کرتا ہے
اگر جوتا بگڑ جائے
اگر سونا چٹخ جائے
اگر لکڑی تڑخ جائے
ہمیں معلوم ہے بابا۔۔۔
ہمیں معلوم ہے بابا۔۔۔''

نظم کا آخری ٹکڑا مکمل رجائیت کا آئینہ دار ہے۔ وحید احمد کو نئی نسل سے بھرپور اُمید ہے کہ وہ لمحۂ جاریہ میں خرابیوں اور بے قاعدگیوں کو پوری طرح سمجھتی ہے اور اُن کے لیے آخری دلیل

(Final argument) صرف اور صرف سچائی ہے اور رَجعت پسندی کے حق میں کوئی مذہبی استدلال جسے علم و دانش کی سند حاصل نہ ہو قطعاً قابلِ قبول نہیں ۔ مذہبی تنگ نظری سے مکمل اجتناب کیے بغیر اور رواداری کو فلسفۂ حیات بنائے بغیر انسانیت کے دکھوں کا مداوا نہیں کیا جا سکتا ۔ وحید احمد صلیب، تلک، ٹوپی، داڑھی اور کیس کے حوالے سے عیسائی، ہندو، یہودی، مسلمان اور سکھ طرزِ فکر کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ مکمل سچائی کسی ایک جگہ مرکوز نہیں ہے۔ علم اور دانش کی بات کہیں نظر آئے چاہے دیوار پر لکھی ہو اُسے قبول کرتے ہوئے نہیں ہچکچانا چاہیے اور اس حقیقت کبریٰ کا بچوں کو علم ہے کیونکہ ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے بچے کائنات کا تسلسل ہیں اور انسان کے بغیر کائنات کوئی معنی نہیں رکھتی اور کسی مفکر کے قول کے مطابق ہر بچے کی پیدائش اس بات کا اعلان ہے کہ خدا ابھی انسان سے مایوس نہیں ہوا اور جب خدا انسان سے مایوس ہوگا تو کیا ہوگا، پیدائش کا سلسلہ رُک جائے گا اور اُن لوگوں پر قیامت آئے گی۔

شیخ محی الدین ابنِ عربیؒ اپنے مکاشفات میں لکھتے ہیں:

''نوعِ انسانی میں جو شخص سب سے آخر میں پیدا ہوگا اور خاتمِ بنی آدم ہوگا۔ اُس کے ساتھ اُس کی جڑواں بہن پیدا ہوگی۔ بہن پہلے پیدا ہوگی اور بھائی بعد میں پیدا ہوگا۔ شکمِ مادر میں بھائی کا سر بہن کے پیروں کے پاس ہوگا۔ وہ چین میں پیدا ہوگا۔ وہ اپنے شہر کی بولی بولے گا۔ اُس کے پیدا ہونے کے بعد مردوں اور عورتوں میں عقم اور بانجھ پن (Sterility) سرایت کر جائے گا۔ نکاح و جماع تو بہت ہوگا مگر ولادت نہ ہوگی۔ اُنہی لوگوں پر قیامت قائم ہوگی۔''(۱۶)

''مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات''

وحید احمد سے تمام تر محبت، ادب و احترام کے باوجود چند جملہ ہائے معترضہ کہنے کی جسارت کروں گا۔

۱) نظم بلاشبہ ایک وسیع کینوس کا احاطہ کرتی ہے لیکن بعض مقامات پر کفایتِ لفظی کی گنجائش نکل سکتی تھی مثلاً ''لرزتی کانپتی اک نوک اُبھری۔۔۔ ساحل کی جانب آ رہی تھی۔''

۲) چند مقامات پر رعایتِ لفظی کی طرف توجہ دلانا چاہوں گا مثلاً ''گھنا پتھریلا ساحل'' اس ترکیب میں گھنا کا لفظ مناسب نہیں لگتا گھنا جنگل اور سائے کی مناسبت سے ہوسکتا ہے اور ویسے بھی خلافِ واقعہ ہے۔

۳) ''سیاہ''بوزنِ فعول کو بروزنِ ''فعل'' باندھا گیا ہے۔
۴) ''گجر دم فجر گونجی'' گجر دم اور فجر دونوں ایک ہی معنی دے رہے ہیں سوایک لفظ اضافی ہے۔
۵) ''سوفسطائی وردی دار'' غالبًا یہاں فاشٹ کہنا چاہتے ہیں کیونکہ سوفسط "Sofists" تو وہ لوگ کہلاتے تھے جو اجرت پر لوگوں کو تعلیم دیا کرتے تھے۔
۶) ''کبھی سوچا بھی ہے تم نے'' یہ مصرع واوین میں ہونا چاہیے
۷) ''جہاں بھر کے بہت سے فلسفی'' اس مصرعے میں ''جہاں بھر'' یا ''بہت سے'' اضافی ہے۔
۸) پروٹا گورس "Protagorus" پہلا سوفسٹ (Sofist) یعنی اجرت پر تعلیم دینے والا مانا جاتا ہے اور سقراط تو اُجرت لے کر تعلیم دینے کے سخت خلاف تھا اور اپنی غربت کو بطور دلیل پیش کرتا تھا سو پروٹا گورس کا سقراط کی پوٹلی میں ہونا عجیب سا لگتا ہے۔
۹) ''زرتشت کا بن باس'' زرتشت کے حوالے سے بن باس کا حوالہ ناچیز کے لیے نئی چیز ہے یہ لفظ تو شری رام چندر جی سے مختص ہے۔
۱۰) پروفیسر سمندر اور دریا مختلف ہوتے ہیں۔۔۔تو کھوج میں پہلا بھی کھو جائے'' سقراط کے اپنے منہ سے اپنی تعریف اچھی نہیں لگی۔
۱۱) ''اُن کی ہر گردن'' ''ہر گردن'' میں ہر کھٹکتا ہے۔

ooo

حوالہ جات

۱۔ (مقدمہ تاریخ از ابن خلدون صفحہ 385)

۲۔ (المنجد۔ لوئیس معلوف، مطبوعہ خزینہ علم وادب لاہور۔ صفحہ 53)

۳۔ کتابِ معراج محمد Le liver de esekiel mahomet مترجم بوناواں تیوغ (Bonaventure) بحوالہ نگارشات۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ، بیکن بکس، ملتان صفحہ 633,632)

4-http://en.wikipedia.org/noisepollution
WHO.Guidelines for community noice (See table on page-16

5-Revelation, Rationality, Knowledge & truth - chapter
1-2 Greek Philosophy - by Mirza tahir Ahmed
http://www.en.wikipedia/socrate:htm)

6-(www.google/ketamine/search)

7-(Hjistory is always biographical) (http://www.indiana.edu/¬e472/
pdf/proginfo/definitions.html http://www.history_difinitions.com
http://www.collections.ic.gc.ca/peh/ teachers/glossary.html
www.wordnet.princton.edu/perl/webwn

8-(http://www.world-gazetter /athens.com
http://www.en.wikipedia.org/wiki/ athens/)

9-(www.historyofwashington.com)

10-(www.history of tokyo. google.search)

11-(http://motherearth.com echological scene efter nuclear war-by Prof. Paul Ehrlic & Assoicates Dept. of Biological Sciences Stanford University. USA. Crisis Relocation for nuclear war - editied by- Jannifer Leaning & Lang ley Keyes - Billionger Publishing Co. P.O Box 281, Harverd Squere, Chamberidge, Massachausetts-02138

Specials Thanks to
Kort Foundation, San Francisco. USA)

12-(Arthmetical Questions by Richard White
http://www.time value of money .com
http://www.en.wikipedia.org/wiki .compound-intrest.htm)

13-(www.wikipedia/das_kapital)

14-www.battleofPalassey-From banglapedia/wikipedia.

15-www.google/'search/mirsadiq/

۱۶۔(فصوص الحکم۔ از ابنِ عربی۔ ترجمہ مولانا عبدالقدیر، ممتاز اکیڈمی لاہور۔ صفحہ 77)

''گروماں'' دردکا سیلِ رواں

—خالد محمود خان—

''گروماں'' ہیجڑوں کے متعلق علی نواز شاہ کا موضوعاتی ناول ہے۔اس ناول میں ہیجڑہ پن کے اسباب سے لے کر طریقِ کار، عادات، اطوار، معاشرت، پیشہ، معیشت، تفریح، طبقاتی رشتہ داری، رقابت، محبتیں، لڑائیاں اور انجام کار تک کے موضوعات کا مسلسل احاطہ کیا گیا ہے۔ یہ ناول پرانے موضوع پر نئی کہانی کی طرح ہے۔علی نواز شاہ کا جدید تحقیقی اور حساس ذہن اپنے موضوع سے ہمدردی اور گرم جوشی کا برتاؤ کرتا ہے۔ ہمدردی اور گرم جوشی ناول نگار کا اساسی رویہ ہے اور ناول کی ہیئت کا تعین بھی کرتا ہے۔کہانی کے آغاز و اختتام، اتار چڑھاؤ، جمود اور بہاؤ مسلسل رواں دواں رہتے ہیں۔کم و بیش ایک زندگی کے ممکنہ دورانیے پہ مشتمل یہ ناول کسی المیے، سانحے اور اندوہ کی کیفیت میں کہیں پڑاؤ نہیں کرتا۔درد و الم اپنے تسلسل میں ناول کے قالب میں ڈھلتے چلے جاتے ہیں اور ذیلی Relevant موضوعات کو جنم دیتے ہیں۔ یہ انداز ناول نگار کی تکنیک بھی ہے اور موضوع بھی۔تکنیک میں موضوع کو متشکل Format کیا گیا ہے اور موضوع ایک ابدی المیے کا تسلسل ہے۔

''گروماں'' کا ایک اور اہم پہلو تحقیق اور کہانی کاری ہے۔ ناول نگار نے اس موضوع پر تحقیق بھی کی ہے اور کہانی کاری بھی۔لیکن چونکہ تحریر کا مقصد ناول نگاری تھا اس لئے تحقیق کو رسمایا (Formalise) نہیں گیا بلکہ کہانی میں ضم کر دیا گیا ہے۔اس سے کہانی میں حقیقت نگاری کا عنصر اجاگر ہوا ہے۔اس لحاظ سے ''گروماں'' اردو ادب میں نمونے کی تحریر ثابت ہوتی ہے۔

مرد اور عورت کی معاشرت میں ہیجڑوں کا نہ کوئی معاشرتی کردار (Role) ہے اور نہ مرتبہ (Status) کسی قابل شناخت معاشرتی گروہ میں ان کا حصہ محض تفریح اور جنسی تسکین فراہم کرنے کے نتیجے میں حاصل کردہ رزق سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ وہ مزدور نہ آجر، سرکاری ملازم نہ بیوروکریٹ، تاجر نہ صنعت کار، سیاستدان، نہ سرکار، استاد نہ شاگرد اور نہ عالم یا فوجی۔ وہ معاشرے میں نظر انداز شدہ،

غیر محفوظ اقلیت ہوتے ہیں۔نظر انداز شدہ اور غیر محفوظ ہونا ''گرو ماں'' کے اساسی تلازمے ہیں۔ پوری کہانی اسی نا قابل اختتام آغاز و انتہا کے تصور پر مبنی ہے۔ گرو ماں اس ناول کا ایسا کردار ہے جو کسی ادارے کی طرح ہے۔اس نے ایک کردار ''شفقات'' کو جس انداز سے ہیجڑہ بنایا وہ کہانی میں واضح ہے۔ گرو ماں کو کس نے اور کس طرح ہیجڑہ بنایا اس کی وضاحت بھی شفقات کے المیے سے ہوتی ہے۔ اس طرح یہ عمل مسلسل اور نا قابلِ اختتام Unending المیے کو جنم دیتا ہے۔ شفقات حیاتیاتی (Biological) خصائص میں مرد تھا۔ اس میں نسوانی رجحانات (Aphrodisiac) نے ہیجڑوں کی طرف راغب کیا۔ گرو ماں نے اس کی اپنے مخصوص انداز میں تربیت کی اور تحفظ دیا۔ پھر اس کا عضوِ تناسل تلف کر کے اس کی جنسی شناخت Identification کو ختم کر کے ہیجڑہ ہونے کی نئی شناخت دی۔ وہ مرد ہو کر بھی مرد نہ رہا۔ مرد نہ رہ کر بھی عورت نہ ہو سکا۔ اس کے وجود میں مردانہ صلاحیتیں موجود تھیں جن کے اظہار اور اطمینان کا ذریعہ ختم کر دیا گیا۔ اس کے وجود میں موجود، موجزن مردانگی عذابوں کی طرح اڈتی رہی۔ علی نواز اس کے احساس کو یوں قلم بند کرتے ہیں۔

''ایک بار غیر ارادی طور پر اس کا ہاتھ اپنے سوختہ جسم کی طرف بڑھا۔ کرب کی ایک لہر اس کے بدن میں سے گزرتی چلی گئی۔''

''وہ۔۔۔شرم و حیا اور ادائیں ملا کر سکڑتا، سمٹتا اور بے تکلف ہوتا رہا۔ کچھ بھاری لمحے بھی گزرے جن میں ناگواریت اور بوجھل پن نے اسے مردہ کر دیا۔''

جب تک شفقات کو درد کی گراں باری کا احساس ہوا اس وقت تک وہ مرد کی دنیا سے ہجرت کر آیا تھا۔ اسے دیکھ کر نسوانیت نے جنت کا دروازہ مقفل کر دیا۔ وہ مرد ہو کر نسوانیت کی کسی ترغیب کے سحر میں تھا اور کہیں کا نہ رہا۔ یہ اس کا گناہ بھی تھا اور سزا بھی۔ اس سبب کے باوجود اس جانکاری کی ضرورت ہے کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ کیا وہ اپنے مردانہ وجود میں غیر مطمئن تھا یا اس کی مردانہ شناخت میں نسوانی ترغیب کی کوئی خرابی تھی۔ کیا یہ خرابی اس کی فطرت میں مرتسم تھی یا اس نے محض حماقت کی۔

سگمنڈ فرائڈ (Sigmund Freud) انسانی ذہن کی تین حصوں میں درجہ بندی کرتا ہے۔

شعور	Consious
تحت الشعور	Sub consious
لاشعور	Unconsious

انسان جس قدر سوچنے، سمجھنے اور کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اسے شعور کہتے ہیں۔ تحت الشعور

سے مراد اضطراری رویوں یا اعمال کی صلاحیت ہے۔ جب کہ لاشعور ماضی کی لامتناہی موروثیت کا خزانہ ہے جو فرد پر زمانہ حال میں حالیہ حقائق کی طرح اثر انداز ہوتا ہے۔ فرائڈ نے اپنے مقالہ "Beyond the Plesure Principle" میں انتقال واحیائے جذبات "Transference" کے تصور کا تعارف اس انداز میں کرایا ہے۔

"Repetition of repressed matirial as a contemporary experience"

''کسی دبے ہوئے مواد (جذبے) کا متواتر تکرار گویا وہ کوئی حالیہ تجربہ ہو۔'' ایسے میں فرد کسی خاص انداز میں ماضی کے کسی بہت پرانے جذبے سے مانوس ہوتا ہے۔

گرونیز Grunes اس کو "Emotional force field of intimacy" قرار دیتا ہے۔ انتقال جذبات کو فرائڈ انسان کے لئے ''ناگزیر حاجت'' Inevitable Necessity قرار دیتا ہے۔ اس سے انسان کا اپنے روابط کی حقانیت Validity of the connections پر ایقان مضبوط تر ہو جاتا ہے۔ جدید فرائیڈ ین تجزیہ کار جیڈی مین Gediman انتقال جذبات کی مزید وضاحت ان الفاظ میں کرتی ہیں۔

> "Real and the transferential are woven together and how a skilful contermprary analyst uses the real and the entrancing surface to work toward an understanding of past and present unconscons meanings"
>
> ''حقیقی اور انتقالی (رویے) آپس میں جڑے ہوتے ہیں کہ کس طرح دور حاضر کا تجزیہ کار حقیقی اور وجدانی سطح پر ماضی اور حال کی لاشعوری معنویت کی فہم پر کام کرتا ہے۔''

اس مہین نفسیاتی نکتہ پر جین ٹکر (Jane Tucker) اپنے مقالہ "Overview of controversies" سٹائن گارٹ (Stienghart) کے نظریۂ انتقالِ جذبات کے متعلق رقم طراز ہیں:

> "Transference is important, in that it offers a window onto fanatasy; the therapeutic relationship is emotionally arranged to enable the repetition compulsion to be experienced"

انتقالِ جذبات "Transfernce" میں شفقات پر نسوانی ترغیب کا دریچہ کھلتا ہے اور مردانگی کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ جو مرد رضا کارانہ طور پر ''نردبان'' ہو کر ہیجڑے بن جاتے ہیں راقم ان کی نفسیات کو فرائڈ کی محولہ بالا نظر سے دیکھتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ''خرابی، ترغیب'' Fantasy

شفقات کی فطرت میں تھی جس کی عورت اور مرد کے معاشرے میں کوئی جزا نہیں۔بس سزا ہی سزا ہے۔ ہیجڑہ، نامرد، ناعورت، عورت اور مرد کے درمیان کا رابطہ نہیں اس کی حیثیت حاشیائی بلکہ جزیرائی (Islandish) ہے۔وہ اس یقین سے محروم ہے جس کی بنیاد پر مرد اور عورت نیکی، برائی، جرم، سزا، ظلم اور ناانصافی کے تصورات کو ارتقاء کرتے ہیں۔وہ جزیرائی معاشرت میں رہتے ہیں اور ان کی معیشت تفریح اور جنسی تسکین کی فراہمی سے حاصل کردہ رزق تک محدود ہوتی ہے۔عمومی انسانی معیشت میں سخت بے یقینی کا شکار ہوتے ہیں اور ایک دوسرے پر انحصار کرتے ہیں۔یہ انحصار ایک دوسرے کا خیال رکھنے سے لے کر ملکیت تک پھیلتا چلا جاتا ہے۔گرو اپنے چیلوں کے حال کو مستقبل کے تقاضوں میں ڈھال دیتا ہے اور اپنے مستقبل کے تحفظ کی ضمانت کا یقین کر لیتا ہے۔ہیجڑوں کا آپس میں رشتہ، شفقت، مروت، تعاون اور محبت سے حسد، رقابت اور دشمنی تک پھیلا ہوا ہوتا ہے۔مگر وہ ان معاملات میں مرد، عورت کے معاشرے کے ارکان کو دخل اندازی کا کوئی موقع نہیں دیتے۔ان کے اپنے منصفین اور عدالتیں ہوتی ہیں۔وہ اپنی عدالتوں کے فیصلوں سے روگردانی نہیں کرتے اور ہر وقت اس کے لیے ہر قسم کی قیمت چکانے کو تیار رہتے ہیں۔مگر زندگی ان سے ان کی Fantasy کی جو قیمت مانگتی ہے وہ ادا نہیں کر سکتے۔''گرو ماں'' میں کشش (ہیجڑہ) رمضان اور پیر منے شاہ شفقات کے المیے کی اپنے اعمال سے تشریح کرتے ہیں۔کشش مرد ہے جو ہیجڑوں کے روپ میں رہتا ہے اور شفقات سے محبت کرتا ہے۔اس کی محبت، شفقت، تعاون، پذیرائی، قربت اور جنسیت تک پھیلی ہوئی ہے۔وہ طویل عرصہ تک شفقات کو رفاقتوں کی لذتیں اور تحفظ فراہم کرنے کے بعد سخی سرور کے میلے میں اپنی جنسی تکمیل سے ہم آغوش ہوتا ہے۔اس کی جنسی تکمیل میں شفقات کی عدم تکمیل فیصلہ ہے۔ناول نگار نے ان لمحوں کے احساس کو ان لفظوں میں تجسیم کیا ہے۔

> ''رات کے کسی پہر اس کی آنکھ پھر کھل گئی۔کشش اس کے ساتھ چپکا ہوا تھا۔اس کی سانس کی رفتار تیز تھی اور ہاتھوں کی گرفت سخت تھی۔
>
> شفقات نے کسمساتے ہوئے مزاحمت کی۔لیکن یہ مزاحمت بھی اسے نہ روک سکی اور وہ ایک ناخوشگوار وقت کو نہ چاہتے ہوئے بھی سہنے لگا۔
>
> پو پھٹنے والی تھی۔۔۔ایک غلیظ نمی کے احساس نے اسے سخت بے لذت کیا۔وہ عجیب بے بسی میں گھرا خود اپنے آپ پر ناراض ساکت لیٹا رہا۔کس سے دکھ کی بات کروں، کسے اپنا سمجھوں۔اسے اپنا وجود کسی دکھتے ہوئے پھوڑے کی طرح محسوس ہونے لگا۔''

شفقات کی رنجش پر کشش اپنی مردانگی کو اپنے عمل کے جواز کے طور پر ثابت کرتا ہے اور شفقات (ہیجڑے) کے درد کا المیہ کی نئی تکرار (Repetition) شروع ہو جاتی ہے۔ رمضان ایک معصوم، دیہاتی، خوبصورت فیاض نوجوان اس کی محبت میں گرفتار ہے۔ محدود کلام کے علاوہ چند روپوں کا شفقات کے ساتھ تبادلہ کرتا ہے اور برائی کے منظر سے کسی مایوس نیکی کی طرح غائب ہو جاتا ہے۔ شفقات اپنے آپ کو رمضان کے ساتھ کسی اور رشتے کا اہل نہیں سمجھتا۔ شفقات کا المیہ اس پر ایک نئے انداز میں ورود کرتا ہے۔ وہ رمضان کی محبت اور اپنے رزق میں ناپاکی کا رشتہ قبول نہیں کرتا اور کشش کے ساتھ کراچی فرار ہو جاتا ہے۔ زندہ پیر کے مزار پر وہ پیر منے شاہ کے ہاتھ چڑھ جاتا ہے۔ پیر کا دست ہوس شفقات کے جسم سے لے کر چند بچے کھچے روپوں تک پھیل جاتا ہے۔ یہ لمحے، منظر، بے حسی اور احساس ان لفظوں میں بیان کئے گئے ہیں:

> ''رات کے آخری پہر مخصوص لمس کے احساس نے اسے گہری نیند سے کچی نیند کی وادی میں دھکیل دیا۔ حتیٰ کہ اس کے حواس پوری طرح بیدار ہو گئے۔ کوئی اس کے ساتھ لیٹا تھا۔ گھٹیا عطر کی تیز بو اور گردن کے پاس چبھتی داڑھی نے اس کے اندر نفرت اور دکھ کے جذبات یوں ابھارے کہ عین ممکن تھا کہ وہ اپنی سلگتی روح کے زیر اثر انتہائی اقدام اٹھاتے ہوئے اس کا گلا دبا دیتا کہ غلیظ نمی کے ساتھ داڑھی اس کی گردن سے ہٹ گئی۔ بے بسی کے احساس سے شفقات کی آنکھوں میں آنسو اتر آئے۔

> ''اس کے دماغ میں داخل ہونے والا پہلا احساس سخت بے زاری اور مایوسی کا تھا۔ رات کا واقعہ یاد کرتے ہی کرب کی ایک لہر اس کے بدن میں دوڑ گئی۔ پہلی بار اسے اپنی حالت اور حالات کا اندازہ ہوا۔ شاید وقت کے ساتھ اس کے اندر بالغیت کی سوچ پیدا ہونا شروع ہو گئی تھی اور یہ بھی ممکن ہے وہ کچھ اور عرصہ اس سنجیدگی سے عاری رہتا اور زندگی کے کسی اور سخت مقام پر اس سے شناسائی پیدا ہوتی۔''

> ''ایک دم اسے خیال آیا کہ اس کی جیب میں دو ہزار روپے تھے جو اس نے موت کے کنویں پر ناچتے ہوئے کمائے تھے۔ اس کا ہاتھ بے ساختہ شلوار میں زپ لگی جیپ کی طرف تیزی سے گیا۔ خالی جیب کسی پرانی جراب کی طرح اس کا منہ چڑا رہی تھی۔ یعنی جاتے جاتے پیر اس کی جیب پر بھی ہاتھ

صاف کر گیا تھا۔''

''گروماں'' کا آغاز شفقات اور جدن بائی کی ایک ملاقات سے شروع ہوتا ہے اور اختتام بھی آخری رفاقت پر۔ شفقات ہیجڑہ کراچی میں جدن بائی کے ہاں سے لڑکیوں کی سپلائی لیتا اور ان کو خریداروں کے ہاں پہنچا کر حاصل شدہ رقم کی بانٹ کانٹ کرتا تھا۔ ہیجڑے پن کی تمام مسافت طے کرنے اور مصائب جھیلنے کے بعد وہ جدن بائی کی قربت میں پناہ تلاش کرتا رہا۔ اس کے اندر کا مرد عورت کی رفاقت میں آسودگی کی لذت سے آشنا ہوا۔ وہ دونوں کراچی سے بھاگ کر عزت و آبرو کی زندگی کی جستجو میں لاہور آ گئے۔ شفقات نے مردانہ وار جینے کی آرزو کی مگر معاشرے نے اس کے غیر مکمل مرد کو رد کر دیا۔ جدن بائی بھی اس کی رفاقت میں عدم تکمیل کے احساس کا شکار ہو کر بیزاری کا احساس کرنے لگی۔ شفقات نے عدم تکمیل کے دریچے سے جھانکا اور ریل کے نیچے سر دے کر خودکشی کر لی۔ وہ عدم تکمیل کی راہ سے گزر کر راہِ عدم سدھار گیا۔ اس کے آغاز کا جس قدر دردناک المیہ تھا اتنا ہی اس کے اختتام پر وقوع پذیر ہوا۔ درد کے سیلِ رواں کو کوئی راستہ نہ ملا۔

خشونت سنگھ کا ناول ''دہلی'' اس کی شاہکار تحریر ہے۔ اس ناول کا ایک پہلو دہلی شہر کی تاریخ اور تہذیب و ثقافت ہے اور دوسرا پہلو ہیجڑہ۔ بھاگ متی ہیجڑہ اس ناول کا مرکزی کردار ہے۔ شفقات کے برعکس وہ پیدائشی طور پر مونث ہیجڑہ ہے۔ مردوں کو جنسی تسکین فراہم کر سکتا ہے اور نسوانی زرخیزی سے محروم ہے۔ وہ معاشرے میں اپنی حیثیت سے متعلق کسی ابہام میں مبتلا نہیں۔ خشونت سنگھ اور اس کا تعلق شفقت، مروت سے لے کر جنسی تسکین تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کے مقابل گروماں کا شفقات اپنے جذبات اور احساسات کی پیچیدگیوں اور ابہام سے کبھی آزاد نہ ہوا۔ بھاگ متی کا اپنے متعلق نہایت شفاف تصور ہے جس سے اس کا اعتماد کبھی متزلزل نہیں ہوتا۔ وہ معاشرے میں اپنی عدم حیثیت کے منصب کو خوش دلی سے نبھاتا ہے۔ وہ اپنی تسلیم میں مطمئن جبکہ شفقات نہ اپنے مرد پن پر مطمئن رہ سکا نہ ہیجڑے پن پر۔

خشونت سنگھ پورے ناول میں بھاگ متی کے ساتھ نظر آتا ہے۔ وہ اس کی چھوٹی چھوٹی بے ایمانیاں، نازنخرے، بیوقوفیاں، اس کی معشوقاؤں سے حسد اور رقابت کو بڑے دھیرج اور دانائی سے برداشت کرتا ہے۔ اس کا رویہ مکمل طور پر شعوری اور انسانیت پرستی پر مبنی ہے۔ ''گروماں'' میں علی نواز شاہ کہانی میں کہیں بھی کردار کے طور پر دکھائی نہیں دیتا۔ وہ اپنے خیالات کے لیے معروضی کردار تخلیق کرتا ہے اور اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتا ہے۔ کہانی لئے آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ وہ اپنے آنسوؤں سے شفقات کی کہانی لکھتا ہے اور خشونت سنگھ اس کو کوزہ بند کر دیتا ہے۔

ابدی جذبہ　Eternal pession

ابدی دُکھ　Eternal pain

ایک جذبہ ہی ابدی المیہ ثابت ہوا۔عورت پن کی طرف راغب ہونے کا جذبہ۔شفقات پیروں فقیروں کی درگاہوں پر ناچ گانے سے زیادہ عقیدت رکھتا ہے۔اس کی روح کو تسکین نصیب ہوتی ہے۔بھاگ متی کے متعلق خشونت سنگھ رقم طراز ہے:

"Then back into the suglight to Sher shah mosque she covers her head with scarf.Even after then years I have known her I am not sure whether.She is a Muslim or Hindu.She says she is both and more because now she is also Sikh".

''واپسی پر دوپہر کی دھوپ میں مسجد شیر شاہ کے پاس سے گزرتے ہوئے وہ اپنے سر کو ڈھانپ لیتی ہے۔یہاں تک کہ گزشتہ دس سالوں سے، جب سے میں اسے جانتا ہوں، مجھے یقین نہیں کہ وہ ہندو ہے یا مسلمان۔اس کا کہنا ہے کہ وہ ہندو بھی ہے اور مسلمان بھی اور اب تو وہ سکھ بھی ہے۔''

شفقات لاہور سے جھنگ مائی ہیرہ، سخی سرور اور کراچی میں زندہ پیر تک کی درگاہوں پر اپنی روح کے لیے سکون کا متلاشی ہے۔وہ مختارا نام گرو ہیجڑے کو اپنا درد دل سناتے ہوئے کہتا ہے:

''میں نے نیت کر رکھی تھی کہ خود محنت مزدوری کروں گی اور خدا کی سیدھی راہ پر چلتے ہوئے زندگی گزاروں گی۔اس میں عزت سمجھتی ہوں۔''

گرو حاجی مختارا ایک مدرسے کے امام سے اس انداز میں مخاطب ہوتا ہے۔

''چوری ہم نہیں کرتے، کسی کا حق نہیں مارتے، محنت کرتے ہیں، ایک ایک پیسہ جوڑ کر بارگاہ رسول ﷺ میں حاضری دی ہے، حج کیا ہے۔آپ لوگ نماز کی بات کرتے ہیں۔اسلامی نقطۂ نظر سے ہماری کمائی حلال ہے۔''

علی نواز شاہ نے شفقات کے کردار کو المیے کے سیاق وسباق میں برتا ہے جبکہ خشونت سنگھ نے بھاگ متی کو ہنس ہنس کر رو دیا ہے۔نتیجہ دونوں کا ایک ہے۔علی نواز شاہ شفقات کو کچھ نہ دے سکنے پر کرب والم کا شکار ہو جاتا ہے اور خشونت سنگھ اسے سب کچھ دے کر خوش اور آسودہ رہتا ہے۔

"These days I have to scout more and more mangoes for the way Bhagmati tucks in, I would not get to eat any. Without as much as your leave she will eat the see or four at a time, suck thier

kernal with great relish that nothing is left on them.She ends her feasting with a loud blech, then proceeds to tie ......washes her hands and face up whatever fruit.remains on the table in the folds of her sari to take them home"I know you Khushwant singh! have not paid for them" she tells me. My poor family has not tasted a mangoe this season. she says as she leaves."

''آج کل مجھے آموں کے لیے کافی دوڑ دھوپ کرنا پڑتی ہے کیونکہ جس طرح بھاگ متی ان کا صفایا کرتی ہے میرے لئے تو کوئی بچتا ہی نہیں۔آم جتنے بھی ہوں وہ تین چار تو کھا ہی جاتی ہے۔وہ گٹھلیاں مزے لے لے کر چوستی ہے اور انہیں چوس چوس کر بالکل صاف کر دیتی ہے۔وہ اپنی ضیافت کا اختتام زوردار ڈکار پر کرتی ہے۔اپنے ہاتھ منہ صاف کرنے کے بعد سارے بچے ہوئے آموں کو ساڑھی کے پلّو میں باندھنے کا اہتمام کرتے ہوئے کہتی ہے ''خشونت سنگھ! تم نے تو ان کی کوئی قیمت ادا نہیں کی میرے خاندان کے کسی فرد نے اس موسم کا آم چکھا تک نہیں۔'' وہ جاتے جاتے کہتی ہے۔

بھاگ متی کا خاندان ہیجڑوں کا خاندان ہے۔وہ ایک ہیجڑے شوہر کی ہیجڑہ بیوی بھی ہے۔وہ اپنے خاندان کے لیے جس انداز میں خشونت سنگھ کے آم اڑاتی ہے یہ شفقات کو نصیب نہیں ہوا۔

"Dussehri and Langra unfortunately they also happen to be Bhagmati`s favoutite.During the mango seasom her visits are more frequent.When she comes she makes a meal of mangoes and takes away what she can not eat.She says they are good for her digestion."

''دوسہری اور لنگڑا بدقسمتی سے بھاگ متی کے بھی پسندیدہ آم ہیں۔ آموں کے موسم بھی بھاگ متی کا آنا جانا زیادہ ہو جاتا ہے۔وہ آ کر آموں سے اپنی تواضع کرتی ہے اور جو بچ جاتے ہیں اٹھا لے جاتی ہے۔اس کا خیال ہے کہ آم اس کے ہاضمے کے لیے بہت ہی اچھے ہیں۔''

خشونت سنگھ بھاگ متی کے بڑھاپے میں اس کی مذہبی ترجیحات اور عقائد کے متعلق لکھتا ہے۔

"She no longer talks of her hijda husband or of sex but of Ramji and of Hindu temples and Muslim Dargahs she visits.She says. She would like to spend her remaining years of life on the banks of Ganga at Hardwar or Varnasai at times she also talks of giong on Haj(or is it umra?) to Mecca and Medina."

''وہ اب اپنے ہیجڑے شوہر یا جنسی معاملات کی بجائے رام جی کے مندروں اور مسلمانوں کی درگاہوں کے متعلق باتیں کرتی ہے۔ جہاں وہ اکثر جاتی ہے۔اس کی خواہش ہے کہ وہ اپنی زندگی کے باقی دن ہردوار یا وارن سائی کے مقام پر گنگا کے ساحلوں پر بسر کرے۔ وہ اکثر و بیشتر حج (یا شاید عمرہ) کے لیے مکہ اور مدینہ جانے کا ارادہ بھی باندھتی ہے۔''

شفقات اور بھاگ متی کے وجود کے لیے معاشرہ تنگیِ داماں کا شکار ہو جاتا ہے وہ پیروں فقیروں کے دامن، درباروں، خانقاہوں اور درگاہوں کی پناہ لیتے ہیں۔ ان کا دردالم انہیں آگے کی منزلوں کی طرف اشارے کرتا ہے اور وہ مکہ مدینہ کی آرزو کرتے ہیں کہ شاید تھم جائے۔

''درد کا سیل رواں''

ooo

فکرِ اقبال کی تہذیبی جہت

—ڈاکٹر شبیر احمد قادری—

علامہ اقبال نے شعور کی آنکھ کھولی تو معدودے چند اہلِ قلم اور مفکر تھے جو قومی مسائل کے بارے میں سنجیدہ نظر آتے تھے ورنہ بیشتر شاعر مروجہ رموز وعلائم سے مملو روائتی انداز کی شاعری کر رہے تھے۔ حالی اور اکبرالٰہ آبادی دو نمایاں ترین شاعر تھے جنہوں نے وقت کی نبض پر ہاتھ رکھا اور قوم کی اس انداز سے رہنمائی کی کہ بعد میں آنے والوں کے لیے مثال بن گئے۔ علامہ اقبال بھی معنوی طور پر انہی کے مقلد تھے۔ انہوں نے اکبر کی ظرافت کے مقابلے میں حالی کی سنجیدہ فکر کو اہمیت دی مگر زیادہ زور اور جوش کے ساتھ۔

یہ بھی مسلمہ حقیقت ہے کہ علامہ اقبال جیسی بلندیٔ فکر اور بلند نظری بہت کم شعرأ کا مقدر بنی۔ انہوں نے ارضی حقیقتوں کو روحانی ترفع عطا کیا اور شاعری میں اپنی جداگانہ راہ نکالی بقول ڈاکٹر وزیر آغا:

> ''اقبال نے عشق کی جہت کو بھی قائم رکھا اور عقل
> کو بھی اپنی شورش پنہائی کا شریک ردساز بنالیا۔''
> (تصوراتِ عشق وخرد، اقبال کی نظر میں، ص107)

علامہ اقبال نے اُردو شاعری میں ایک ایسا اسلوبِ شعر متعارف کروایا جو ہیئتی اعتبار سے تو روائتی تھا مگر موضوعات وتصورات کے حوالے سے بالکل نیا تھا۔ وہ خود جس تہذیبی بہاؤ کا حصہ تھے اس میں ان کی یہ ڈکشن بہت مقبول ہوئی بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتے تھے اس کے لیے لازمی طور پر ایسی ہی زبان اور اسی قسم کا لہجہ درکار تھا اور اپنی ندرتِ خیال کی بدولت انہوں نے اس میں رنگینی اور رعنائی پیدا کر دی۔ اپنی تمام صلاحیتوں کو انہوں نے اُمتِ مسلمہ کی فلاح واصلاح کے لیے وقف کئے

رکھا۔ کیا یہ اقبال کا کمال نہیں کہ اپنی شاعری میں جن اسرار کو دریافت اور بے حجاب کرنے کی بات کرتے ہیں وہ دریافت اور بے حجاب ہوتے ہوئے نظر بھی آ رہے ہیں وہ ایسے مومن کی تلاش میں تھے جو گفتار کے ساتھ ساتھ کردار میں بھی اللہ کی برہان ہو۔

علامہ اقبال کے ہاں مسلم تہذیب کی شکستگی اور اقدار عالیہ کی پامالی کا کرب ضرور ملتا ہے اور یہی کرب ان کی تخلیقات میں مسلمانوں کے جداگانہ قومی تشخص اور شناخت بن کر سامنے آیا۔ وہ چاہتے تھے کہ افراد ملت کوتاہی عمل ترک کر کے حرکت کو شعار زیست بنائیں کہ حرکت میں برکت ہے۔ اقبال مسلمانوں کے فکری ارتقاء اور تہذیبی بقا کے معاملے میں بہت سنجیدہ دکھائی دیتے ہیں۔ اس حوالے سے ان کا فلسفہ تحرک بجا طور پر اہمیت رکھتا ہے۔ افادی نقطۂ نظر سے نئی دُنیائیں دریافت کرنے سے نئے امکانات بھی فکر مومن کا حصہ بنتے ہیں۔ اُمتِ مسلمہ کو نئے امکانات کی تلاش میں مدد دینے اور راغب کرنے کے لیے انہوں نے اسلوب بھی نیا اختیار کیا۔ نئی تراکیب وضع کیں۔ مردہ اور پژمردہ لفظ اقبال کی فکر کا حصہ بن کر حیاتِ نو کے لمس سے آشنا ہوئے۔ اقبال کی طربیہ شاعری ہو یا حزنیہ ان میں اقبال کی فکر کا پرتو بڑا توانا نظر آتا ہے اور لفظ و معنی کا رشتہ اتنا مضبوط کہ اقبال کی فنی عظمت اور مشاقی کو بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ بقول جابر علی سیّد:

> ''بڑا شاعر وہ ہوتا ہے جو مردہ استعاروں کو
> دوبارہ زندہ کر دے اس طرح کہ ان میں نئی توانائی نئی زندگی
> اور نئی معنویت پیدا ہو جائے اس حسن کاری میں اقبال یکسر
> منفرد اور یکتا ہے۔'' (اقبال کا فنی ارتقاء، ص83)

علامہ اقبال ایک ایسی دھرتی کے رہنے والے تھے جو دراوڑں، کولوں اور آریاؤں کی آبادگاہ تھی۔ آریاؤں کی تہذیب مقامی تہذیب کے سامنے اپنا رنگ نہ جما سکی اور اس میں جذب ہو کر رہ گئی۔ یہ عمل مقامی زبانوں پر بھی نظر آتا ہے۔ سنسکرتوں کی جگہ پراکرتوں نے لینا شروع کی۔ یہاں بھگتی تحریکیں چلتی رہیں یہ اسلام کی تعلیمات تھیں جنہوں نے ہندوستانی تہذیب اور لسانیات کو بڑی حد تک متاثر کیا اور ہندوستانی تہذیب سے الگ مسلم تہذیب کا ڈول ڈالا۔ دونوں تہذیبوں نے ایک دوسرے سے کم وبیش اثرات ضرور قبول کئے مگر دریا کے دو دھاروں کی طرح ایک دوسرے سے مل نہیں پائیں۔ اسلام سے پہلے یہاں آنے والی اقوام اپنی روایات و اعتقادات سمیت مقامی تہذیب کا حصہ بنتی رہیں مگر اسلامی تہذیب ابتداء سے لے کر اب تک اپنا الگ تشخص و تخصص رکھتی ہے۔

جیلانی کامران نے فکرِ اقبال میں مضمر تہذیبی رویوں کی تفہیم و تعبیر کے لیے اسے تین حصوں

میں تقسیم کیا ہے:

i۔ مسلمانوں کا ماضی سے تعلق ii۔ مغربی تہذیب کا منظر

iii۔ مستقبل کا تناظر

اس حوالے سے وہ رقمطراز ہیں کہ:

''فکرِ اقبال میں جن بنیادی تہذیبی رویوں کی نشاندہی کی گئی ہے اُن سے انسانی زندگی کا رُخ متعین ہوتا ہے اور اِنسان اپنے لیے نئے زمانے اور نئی دنیائیں تخلیق کرتا ہے جو زمین پر وجودِ مطلق کے احسانات کی گواہی دیتی ہیں۔''

(ہمارا ادبی و فکری سفر۔ص،127)

علامہ اقبال نے ادب و شاعری، فنِ تعمیر، مصوری، مجسمہ سازی۔۔۔جیسے علوم وافکار پر کھل کر بحث کی ہے جو کسی بھی قوم کے کلچر اور آگے چل کر تہذیب کے بنانے اور بگاڑنے میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ان کا طرزِ فکر کچھ اور ہی تقاضے رکھتا ہے وہ عام شاعروں کی طرح نہیں تھے نہ حقیقت کو افسانہ بنا کر پیش کرنے والے روائتی ہنرمندوں کی طرح وہ قلم و قرطاس سے رشتہ رکھتے تھے۔

نہ پنداری کہ من بے بادہ بستم مثال شاعراں افسانہ بستم

نہ بینی خیرزاں مرد فرو دست کہ برمن تہمت شعر وسخن است

بجریلِ امیں ہم داستانم رقیب و قاصد و دربان ندانم

اقبال ایسی تہذیب کی تشکیل کے خواہاں تھے جس کا آشیانہ شاخ نازک پر نہ ہو بلکہ وہ توانا اور مضبوط بنیادوں پر استوار ہو۔ان کی شاعری ایک ایسی بانگ درا ہے جس سے خوابیدہ دل جاگ اُٹھے۔ اقبال نے دانش حاضر کی سحرِ قدیم کا زور توڑنے کے لیے ''چوب کلیم'' کو لازم قرار دیا۔اقبال جدید (مغربی) تہذیب کو کبھی دانشِ حاضر کبھی دانش فرنگ اور کبھی حکمتِ مغرب کے نام سے یاد کرتے ہیں اور اس سے صرف اسی قدر استفادہ کے قائل ہیں جس سے اپنے تشخص اور تخصص پر حرف نہ آئے۔یعنی خذ ما صفا ودع ما کدر والی بات ہے۔ وہ راضی برضا رہے کے فلسفے کو عام کرنے والے روائتی شاعروں اور ادیبوں کے سخت خلاف ہیں وہ بندہ مومن کو ممکناتِ زندگی کا امیں اور معمارِ جہاں قرار دیتے ہیں۔ مغلوبِ گماں رہنے والوں کو یقین کی دولت سے مالا مال کرتے ہیں وہ ان اسباب و علل پر غور و تفحص کی دعوت دیتے ہیں جو مسلمانوں کے زوال پر منتج ہوئے۔ وہ جو کبھی چرخ جہاں پر آفتاب بن کر چمکے وہ جن کا داغ سجود مثال ماہ روشن تھا وہ جو خودنگر اور خوددار تھے کیوں پسماندہ ہو گئے۔ وہ صاف لفظوں میں

کہتے ہیں:

نئی تہذیب تکلف کے سوا کچھ بھی نہیں
چہرہ روشن ہو تو کیا حاجت گلگونہ فروش

حرارت ہے بلا کی بادۂ تہذیب حاضر ہیں
بھڑک اُٹھا بھبھو کا بن کے مسلم کا تنِ خاکی

علامہ اقبال کے افکار کا جو دائرہ انجمن کشمیریاں اور انجمن حمائت اسلام سے بننا شروع ہوا وہ موتمر عالم اسلامی اور گول میز کانفرنسوں تک پھیل گیا اور دیدۂ بینائے قوم بن کر رہنمائی کا فرض ادا کیا۔ وہ معیشت اور معاشرت دونوں شعبوں میں مسلم اُمہ کی ترقی چاہتے تھے اور اس بات کا کامل یقین رکھتے تھے کہ جدید تہذیب کے ترشوائے ہوئے اصنام ماحول میں بہتری نہیں لا سکتے۔ وہ سرمایہ دارانہ نظام کی اس لیے مخالفت کرتے ہیں کہ اس سے ایسی سماجی قباحتیں جنم لیتی ہیں جن کی وجہ سے کوئی بھی معاشرہ بہتری کی جانب گامزن نہیں رہ سکتا۔ خود مغربی تہذیب بھی سرمایہ دارانہ نظام کی وجہ سے نا قابل قبول ہے اس کے لیے وہ ایسی تہذیب کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ جو معاشی استحصال سے پاک ہو جہاں عدل و انصاف کا دور دورہ ہو''ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر'' میں اقبال رقمطراز ہیں کہ ''سب سے زیادہ اہم عقدہ اس مسلمان کے سامنے جو قومی کام کے لیے اپنے آپ کو وقف کرنا چاہتا ہے یہ ہے کہ کیونکر اپنی قوم کی اقتصادی حالت سدھارے اس کا فرض ہے کہ ہندوستان کی عام اقتصادی حالت پر نظر غائر ڈال کر ان اسباب کا پتہ لگائے جنہوں نے ملک کی یہ حالت کر دی ہے۔'' سرمایہ و محنت کے درمیان توازن پیدا کئے بغیر اقبال کی مثالی تہذیب کا تصور مکمل نہیں ہوتا وہ گھناؤنے سامراج کو اپنے فکری نظام سے ہم آہنگ نہیں پاتے اور سمجھتے ہیں کہ شیشہ گرانِ فرنگ نے مشرق کے تہذیبی رویوں کو ہمیشہ نیچا دکھانے اور نیست و نابود کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے لیے لازم ہے کہ اہل مشرق اپنی خودی پہچانیں۔ خاص طور پر مسلمانوں کو وہ احساس دلاتے ہیں کہ وہ جمادات و نباتات کی طرح تقدیر کے نہیں بلکہ احکام الٰہی کے پابند ہیں۔ آج اگر ''سراپا نیاز'' مجموعہ نیاز ہیں اور ان کی کلاہِ لالہ رنگ زمانہ میں رسوا ہے تو یہ احکام الٰہی سے دوری اور بیگانگی کا نتیجہ ہے۔ اقبال اس دوری کو حضوری میں بدلنے کے لیے اپنی قوم کو آمادہ سعی کرتے ہیں۔ ''پیام مشرق'' کے دیباچہ کے یہ الفاظ ان کے فلسفہ سعی کو سمجھنے کے لیے واضح اشارہ ہیں۔ ''اقوام مشرق کو یہ محسوس کر لینا چاہیے کہ زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب نہیں پیدا کر سکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب

تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔''

علامہ اقبال اپنے عہد کی علمی، سیاسی، لسانی اور ادبی تحاریک کا گہرا شعور رکھتے تھے۔ مذہب، جنگ جنس اور سماج کے بارے میں رومانی اور حقیقت پسند عناصر کے خیالات وافکار پوری طرح ان کے علم میں تھے وہ مثبت اقدار کا احیاء چاہتے تھے۔

علامہ اقبال مغربی تہذیب کی مخالفت برائے مخالفت نہیں کرتے بلکہ وہ مغربی تہذیب کی اندھی تقلید کی تباہ کاریوں کا احساس دلانا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے انہوں نے کئی اصناف واسالیب اپنائے مغربی تہذیب سراسر تعقل پسندانہ رویہ رکھتی ہے لہٰذا ایک مفکر شاعر کی حیثیت سے وہ افرادِ قوم کو خبردار کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

ے سن لے تہذیب حاضر کے گرفتار
غلامی سے بہتر ہے بے یقینی

وہ دیار مغرب کے رہنے والوں کو یوں مخاطب کرتے ہیں:

ے تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا
دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرسم عیار ہو گا

علامہ اقبال بندوں کو تولنے کے بجائے بندوں کو گننے والوں کے تہذیبی افکار سے اس لیے زیادہ پسند نہیں کرتے کہ گدھے اور گھوڑے میں تمیز نہیں کرتے۔ ایسی تہذیب کو اپنایا مصیبتوں اور فتنہ سامائیوں کو دعوت دیتا ہے۔ وہ یہ سب کچھ اس لیے کہہ رہے تھے کہ اپنے قیام یورپ کے دوران میں انہوں نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا:

ے عذاب دانش حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثل خلیل

ے حکمت مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی
ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کردیتا ہے گاز

ے تازہ پھر دانش حاضر نے کیا سحرِ قدیم
حذر اس عہد میں ممکن نہیں بے چوبِ کلیم

علامہ اقبال مسائل ہی بیان نہیں کرتے ان کا حل بھی تجویز کرتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ جب قومیں زندگی کی دوڑ میں خود پیچھے رہ جائیں تو وہ آگے نکل جانے والی قوموں کو اپنی رہنما مان لیتی ہیں گویا جھگڑا برتر اور کم تر کا ہے۔ احساس ذمہ داری اور غیر ذمہ داری کے حامل افراد کا ہے۔ ابن خلدون نے کیا عمدہ بات کہی ہے کہ پیچھے رہ جانے والی اور مرعوب قومیں غالب قوموں کی تقلید اُن کی خوبیوں میں نہیں بلکہ کمزوریوں اور برائیوں میں ان کی تقلید کرتی ہیں۔ اس کی وجہ اس کے نزدیک یہ ہے کہ ترقی یافتہ افراد و اقوام کی تقلید حوصلے کی بات ہے جب کہ جو قومیں مرعوب ہوتی ہیں وہ حوصلے سے عاری ہوتی ہیں۔ اس وجہ سے پسماندگی ان کا مقدر بن جاتی ہے۔ علامہ اقبال نے "RECONSTRUTION OF RELIGOUS THAT IN ISLAM" میں شامل پہلے خطبہ "KNOWLEDGE AND RELIGIOUS EXPERIENCE" میں مغربی تہذیب کی ترقی اور مسلمانوں کی ان سے اثر پذیری کے بڑھتے ہوئے رجحان کے حوالے سے اسی حقیقت کی نشاندہی کرتے ہیں:

> "The most remarkable phenonlenon of modern history however, is the encrmcus rapidty with which the world of Islam is spiritually moving towards the west. There is nothing wrong in this movemert, for European culture, on its intellectual side, is only a further development of some of the most important phases of the culture of Islam. Our only fear is that the dazzling exterior of european culture may arrest our movement and we may fail to reach the true inwardness of the culture."(P-6)

اقبال کے تہذیبی افکار میں اس بات کو بڑی اہمیت حاصل ہے کہ مسلمانوں میں تعلیم عام ہو اور تحقیق و جستجو کا ذوق نمایاں تر ہو۔ اس کا ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ مسلمان اپنی تہذیبی اساس کا بہتر طور پر تحفظ کر سکیں گے دوسرا یہ کہ وہ غیروں کی تہذیبی اور فکری یلغار کا مقابلہ کرنے کے لیے بہتر پوزیشن پر آ جائیں گے۔

علامہ اقبال اہلِ یورپ کو اس حوالے سے ضرور پسند کرتے ہیں کہ وہ مقابلتاً محنتی اور Efficient ہیں اور بس۔ اس تناظر میں وہ افراد قوم کو بھی اپنے اندر یہ صلاحتیں اور جوہر پیدا کرنے کی تعلیم دیتی ہیں۔ پروفیسر مرزا محمد منور مرحوم لکھتے ہیں:

> "Iqbal exhorted the Muslim east to imbib

the spirit of hard work and taste for scientific discovery in which lay the real strength of Europe"

(Iqbal pcet philcscph of Islam P:86)

اقبال بجا طور پر سمجھتے ہیں کہ معاشرہ محض مادہ پرستی سے عبارت نہیں اس ہیں روحانی عناصر کو بھی جگہ ملنی چاہیے اور یہ عناصر مسلم تہذیب ہی میں پائے جاتے ہیں۔ ان کے تہذیبی افکار کا ماخذ وہ دین مبین ہے جو مطلق العنانیت کو نہیں منشائے ایزدی کو اوّلیت دیتا ہے۔ جس میں اِنسانیت کی بہبود کی واضح تعلیمات موجود ہیں اور اس کا اعتراف بعض دیگر مفکروں کی طرح فلپ حطی نے بھی اپنی کتاب "History of the arab" (ص22-120) میں کہا ہے۔ فکر اقبال کے تہذیبی عناصر سراسر روح عصر لیے ہوئے ہیں، لکھنے والا کوئی بھی ہو جب تک وہ اپنے عہد کی معاشرتی، سیاسی اور تمدنی تحاریک ونظریات سے باخبر نہیں ہوگا۔ روح عصر سے اس کی تحاریر تہی رہیں گی۔ اس کے برعکس کھلی آنکھیں رکھنے والا ادیب ہمیشہ معیاری اور تادیر زندہ رہنے والا ادب تخلیق کرتا ہے۔ علامہ اقبال نہ صرف برصغیر بلکہ مغرب کی مختلف النوع تحریکوں اور نظریوں کا گہرا شعور رکھتے تھے ان میں سے بعض ان کے فن اور فکر کا حصہ ہیں اور بہت سے نظریات کو انہوں نے ردّ کردیا ہے۔ اس سے ان کے افکار پر معاصر تحریکوں اور نظریوں کے نقوش ضرور موجود ہیں مگر صرف اتنے جتنا وہ چاہتے تھے اور یہی ایک فکری توانائی کے حامل فن کاری کی پہچان ہوتی ہے۔

علامہ اقبال صرف مغربی تہذیب کے نہیں ہندو تہذیب کو بھی بعینہٖ قبول کر لینے کو مسلم تہذیب کے لیے خطرناک خیال کرتے ہیں۔ ہندوؤں نے اپنی متعصب ذہنیت کی وجہ سے خود کو فکری طور پر مسلمانوں سے دور رکھا حتیٰ کہ مسلمانوں کی حکمرانی کے دور میں بھی ہندو تہذیب کو مغلوب نہ ہونے دیا۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ مسلمان ہمیشہ دوسری تہذیبوں کو قبول کرکے آگے بڑھنے کی راہ پر گامزن رہے۔۔۔ علامہ اقبال اس حوالے سے کچھ ذہنی تحفظات رکھتے تھے۔ جب 1930ء میں الٰہ آباد میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں انہوں نے یہ کہا کہ ''اسلام کا مذہبی نظام خلقی طور پر اس معاشرتی نظام سے مربوط ہے جو اس نے تخلیق کیا ہے ایک کے ردّ کرنے سے دوسرے کی تردید بھی لازمی ہوجاتی ہے۔ اس لیے ہندوستانی قومیت پر ایک مدنی نظام کی تعمیر جو اسلامی اصول اجتماعیت کی جگہ لے لے، مسلمانوں کے تصور میں بھی نہیں آسکتی۔'' اور جب اقبال یہ کہتے ہیں کہ ایک علیحدہ مسلم ریاست کا قیام ہی ہندوستان میں امن کا ضامن اور مسلمانوں کو درپیش مسائل کا ممکنہ حل ہے تو وہ دراصل مسلمانوں کی فکری اور تہذیبی حوالے سے ایک شناخت اور اس شناخت کے قائم رہنے کی بات کررہے تھے۔

ooo

وجودیت

—بازغہ قندیل—

عصرِ حاضر کی فکری تحریکوں میں سب سے زیادہ فکر انگیز اور متنازعہ تحریک وجودیت (Existentialism) کی ہے۔ وجودیت عصرِ حاضر کی نمائندہ تحریک بنتی جارہی ہے جو ہر شعبے کو ہی ممتاز کررہی ہے۔ وجودی ادب میں تخیل کی رنگینی، شدتِ جذبات اور فکر کی رفعت بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔

وجودیت ہمارے عہد کا فکری مرقع ہے جو اس عہد کی مخصوص بے چینی، کشیدگی، تشویش اور کھچاؤ فرد دشمن عقیدوں اور روحانیت کے زوال کا نتیجہ ہیں ان کا اظہار وجودیت میں ہوتا ہے۔ انیسویں صدی تجسّس اور اضطراب کی صدی تھی اس صدی میں انسان زندگی، عقل اور معاشرے کی گتھیاں سلجھانے میں مصروف رہا۔ اس کے فلسفہ میں شامل ہونے اور نہ ہونے کے بارے میں متعدد آراء سامنے آتی ہیں جو اسے فلسفے سے علیحدہ تصور کرتے ہیں۔ اُن کی رائے یہ ہے کہ اپنے فکری مزاج اور منہاج (Method) کے اعتبار سے یہ فلسفے کی ضد ہے۔ عام طور پر اس کے آغاز کے بارے میں:

> ''خیال کیا جاتا ہے جب ہیگل کے جدلیاتی نظامِ فکر کی صورت میں جرمنوں (یا فلسفے) کی مثالیت پسندی (Idealism) حد سے تجاوز کرگئی تو اس کے خلاف شدید ردِّ عمل کا اظہار ہوا۔ اس ردِّ عمل کا اظہار کرنے والوں میں نطشے، کارل مارکس اور کیر کے گارڈ اہمیت کے حامل ہیں جن کے افکار بذاتِ خود دبستانوں کی صورت اختیار کرگئے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وجودی فکر کا آغاز پاسکل (Pascal) ۱۹۶۲ء-۱۹۲۳ء سے ہوتا ہے۔۔۔''(۱)

اُن کے یہاں درج ذیل خیالات وجودی فکر کی پیش روی یا پیش بینی کرتے ہیں یعنی:

۱۔ عقل و خِرد حقیقت کو نہیں پا سکتے کیونکہ عقل و خرد جذبہ و تخیل کے رحم و کرم پر ہوتی ہے۔

۲۔ انسان ذہنی کرب میں مبتلا ہے اسی کرب کی حالت میں وہ صداقت کو پا سکتا ہے۔
۳۔ انسان اور فطرت میں کسی قسم کی ہم آہنگی نہیں پائی جاتی۔

وجودیت کے حوالے سے جب ایسی اُدھوری اور متضاد چیزیں سامنے آئیں تو سورین کیر کے گارڈ (۱۸۱۳ء۔۱۸۵۵ء) جو ڈنمارک کا رہنے والا تھا اس کی سوچ کو نئی راہ مل گئی اُس نے قدیم فلسفیانہ روش کو مزید صراحت کے ساتھ رد کیا اور کچھ ایسے خیالات پیش کیے جو شدید احساسِ گناہ خوف زدگی' افسردگی اور مردہ دلی کے احساسات کا ثمر تھے۔

وہ ایک بے حد یاسیت پسند انسان تھا اور زندگی اور دُنیا کی کوئی خوبی یا خوبصورتی اس کی نظروں میں نہیں جچتی تھی وہ شدید احساس کمتری کا شکار تھا۔ اُس کی تحریروں میں موروثی گناہ (Original) دہشت یا تشویش (Anguish) کے الفاظ کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ کیر کے گارڈ کے نزدیک زندگی کا عقلی تعبیر کے مقابلے میں یہ بات زیادہ اہم ہے کہ انسان یہ دیکھے کہ :

> ''انسان کس جوش اور جذبے سے اس ہست موجودگی میں زندہ رہتا ہے جس کا انتخاب خود اس نے اپنے لیے کیا ہے۔''

پھر وہ مزید کہتا ہے کہ :

> ''عقلیت پسند محض ایک معروضی مفکر ہے جو تمام احساسات وجذبات سے قطع نظر کر لیتا ہے جب کہ موجودگی پسند موجودگی کے جذباتی پہلوؤں میں اپنے اپ کو کھو دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ موجودیت پسند کو موضوعی مفکر کہا جا سکتا ہے۔''(۲)

معاشرے میں انتشار، عدم تحفظ، سماجی، سیاسی انتشار، جمالیاتی اقدار کی شکست وریخت اور جن چیزوں سے ہماری ثقافت صورت پذیر ہوئی ہے اس نے ہی وجودی فلسفے کو خام مواد فراہم کیا ہے جو اس کی تغیر ہے۔ منطقی صورت، حاصل بھی اور اُس کی تنقید بھی وجودی فلسفے سے بالعموم یہی نتیجہ ہوتا ہے کہ یہ انسان کو بیچارگی' نا اُمیدی اور خود غرضی کا سبق دیتا ہے۔ خدا سے انکار کر کے فرد ایک بڑے سہارے سے محروم ہی نہیں ہوا بلکہ اس سے دُوری انسانیت سے دُوری ہوئی۔ انسانی اقدار سے دوری ہوئی۔ انسان تنہائی اور بے بسی کا شکار ہوا۔ بیسویں صدی کو دو عالمگیر جنگوں نے یورپ کے مادہ پرست انسان کو بری طرح جھنجھوڑ دیا تھا اور عالمی جمہوریت رفتہ رفتہ اسی کے پیش نظر آمریت میں تبدیل ہونے لگی۔ یہ بات بالکل صحیح ہے کہ انسانی زندگی کی تفہیم فرد کے احوال کے پیشِ نظر ہو سکتی ہے کیونکہ یہ چیزیں کسی فلسفے اور منطق کے ذریعے نہیں، جو زندگی کے حقیقی تجربے کا احاطہ نہیں کر پاتیں کیوں کہ زندگی کا فلسفہ ان سے ماورا ہوتا ہے۔

وجودیت اپنی نوعیت فکر کے اعتبار سے ایک انوکھا اور اچھوتا فلسفہ ہے۔سارتر کا خیال تھا کیونکہ اُس نے جنگ کو خود دیکھا تو اِس لیے وہ کہتا تھا کہ جولوگ صداقت پر یقین رکھتے ہیں وہ کبھی بھی جنگ میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔اُس نے ظلم و بربریت کے خلاف مزاحمت کے لیے "The Files" اور "No Exit" لکھے اور "Being and Nothingness" میں وجودی فلسفے کا فکری زاویہ پیش کیا اور یہی وجہ تھی کہ اُس نے اِسے ایک تحریک کا رنگ دینے کے لیے ادب تخلیق کیا اور ادبی نظریات کو نئی توضیحات سے متاثر کرنے کی سعی کی۔لہٰذا سارتر کی نظر میں ادب زندگی کا آئینہ نہیں بلکہ یہ انسانی وجود کو ثابت کرنے کی کوشش ہے اور ادیب کرداروں کو تخلیق نہیں کرتا بلکہ اُن کی مدد سے اپنے ہی وجود تک رسائی کرنا ہوتا ہے۔وجودیت کی تحریک نے جدید فن کو ایسی جہت دی جس میں عدم خود ایک حقیقت کی طرح سامنے آتا ہے۔سارتر، کامیو، رلکے، کافکا اور دستوئیفسکی وغیرہ کی تخلیقات ایسی ہیں جو وجود کو جوہر پر فوقیت دینے کا واضح رجحان ہے۔

وجودی تحریک نے یورپ کی مشینی زندگی میں گم ہوتے ہوئے انسان کو برآمد کرنے کی کوشش کی۔تاہم انسان کا اعلیٰ منصب ماحول کی بے معنویت سے ہم آہنگ نہ ہوسکا تو ظاہر ہے کہ انسان کے حصے میں صرف قنوطیت اور مایوسی ہی آئی اور یہ کیفیت ساتھ ہی ساتھ اتنا در آئی کہ لوگ اپنی زندگی کو خوبصورت اور دِل آویز و دل کش بنانے کے بجائے اپنی زندگی ختم کرنے پر ہی آمادہ ہو گئے۔ جب افلاطون نے اپنا نظریہ پیش کیا تو اُس کی مثالیت نے جوہر اور وجود کے فرق کو مٹا دیا لہٰذا اس موقع پر جو چیز کام آئی وہ مذہب ہی تھا جس نے فرد کی شخصیت کو ریزہ ریزہ ہونے سے بچالیا جب کہ مغرب میں یہ رشتہ سائنس کی بدولت ٹوٹ گیا۔یہی وجہ ہے کہ وہاں پر وجودیت شدت سے سامنے آئی اور مشرق میں جہاں روحانی قدروں پر ابھی تک زوال نہیں آیا وجودیت کی تحریک کسی خاص انداز میں سامنے نہیں آئی۔اہم بات یہ ہے کہ مغرب میں بھی وجودیت کا اثر اور عمل زیادہ شدت اور زیادہ عرصے تک نہیں رہ سکا اور جلد ہی پوری طرح شروع ہوئے بغیر اس کے خلاف ردِّعمل شروع ہو گیا۔

اگر لفظ ''وجودیت'' کے مفہوم ہی کو لیں تو یہ ہر قسم کے محض تجریدی، منطقی و سائنسی فلسفہ کی نفی ہے جو کہ عقل کی مطابقت سے انکار ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ فلسفہ کو فرد کی زندگی، تجربے اور اس تاریخی صورتِ حال سے گہرے طور پر مربوط ہونا چاہیے جس میں فرد خود کو موجود پاتا ہے۔

یاسیت کے امام ''ہائیڈیگر'' کے بارے میں محمد علی صدیقی رقمطراز ہیں:

''ہائیڈیگر کے خیالات صرف نراجیت پر ختم نہیں ہوتے بلکہ اس کے ہاں یہ احساس بھی جلوہ گر ہوا کہ اس دورِ ابتلا کو انسانی کوششوں سے نہیں ٹالا

جا سکتا۔ خود وجود (Existence) ہی انسان کو تباہی سے بچا سکتا ہے اور وجود کی ''بازیافت'' الفاظ ہی کے ذریعے ممکن ہے۔''(۳)

وجودی کہتے ہیں کہ سائنس ہمارے حیاتیاتی وقدری مسائل حل کرنے کی اہل نہیں ہے وہ کہتے ہیں کہ سائنس کی اہمیت ان کی افادیت میں مضمر ہے وہ صداقت کی یافت کے ذریعے کے طور پر اہم نہیں، عقل کی مدد سے حقیقت تک رسائی ناممکن ہے اور منطقی تراکیب بھی اس سلسلے میں معاونت نہیں کرسکتیں۔ عقل کی مطابقت پر ایمان غیر عقلی ہے کیونکہ عقلی قوتیں قطعی طور پر معدود ہیں کیونکہ عقل کی مطابقت سے انکار وجودیوں کی اساسی صفت ہے، انہیں کی بنا پر پروفیسر بختیار حسین صدیقی نے وجودیت کے مندرجہ ذیل عمومی نقاط کی جانب توجہ مبذول کروائی ہے۔

''ا۔ تمام وجودی (لاشعوری طور پر کرکیگارڈ بھی) انسانی وجود کو شعور کے مترادف قرار دیتے ہیں اور اس کی وضاحت کو وجود کی داخلی ترکیب کی وضاحت سمجھتے ہیں شعور اُن کے نزدیک ہمیشہ کسی دوسری شے کا شعور ہے۔

۲۔ وہ سب انسانی وجود کی بے مثل انفرادیت اور داخلیت پر ایمان رکھتے ہیں وجود ان کے نزدیک تصور نہیں عمل کا جذبہ منفرد ہے سچائی اور نیکی اُن کے ہاں معروضی حقائق نہیں داخلی تفرقات ہیں ان کے نزدیک ایک بے مثل فرد کی طرح مصدقہ زندگی بسر کرنا سب سے بڑی بات اور قدر ہے جب کہ عام انسانوں کی مانند غیر مصدقہ زندگی بسر کرنا سب سے بڑا گناہ ہے۔۔۔''(۴)

کرکیگارڈ کے فلسفے کی نمایاں خصوصیت جو اُسے انیسویں صدی کے دیگر ممتاز فلاسفرز سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں سائنسی یا طبعی مسائل کا کوئی ذکر موجود نہیں اُس کی توجہ کا مرکز ''انسان'' ہے جس پر ''بشر مرکزیت'' کا الزام عائد کیا جاتا ہے لیکن اگر ہم اُس کے کل فلسفے کو پیشِ نظر رکھیں تو ہمیں یہ سوچنا پڑے گا کیونکہ اُس کا خیال ہے کہ بنیادی مسئلہ انسان اور خدا دونوں پر حاوی ہے۔ وہ ان دونوں کے باہمی تعلق کا خواہاں ہے۔ وہ کہیں بھی وجودِ باری تعالیٰ کو ثابت کرنے کی کوشش نہیں کرتا اور اسے توہین سمجھتا ہے اس لیے وہ حضرت عیسیٰ کے حوالے سے ہی بلاچوں چراں قبول کر لیتا ہے۔

کرکیگارڈ سے یہ نظریہ چلتا چلتا جب اُس کے پیروکاروں تک پہنچتا ہے تو معمولی ردّوبدل کے ساتھ ساتھ اس نظریے کو بڑھاوا ملتا ہے اور ساتھ ہی واضح تبدیلی نظر آتی ہے اگر کولن ولسن کو دیکھیں تو وہ سارتر کے نظریے کے خلاف بات کرتا ہے جس کو ہم جوش ملیح آبادی کی اس مثال سے سمجھتے ہیں:

''کہ انسانی دماغ کے گوشوں اور تحتِ شعور کے تہ خانوں میں دنیا کا

کون سا علم ہے جو موجود نہیں یہ اور بات ہے کہ ہم کو اب تک اس کا پتہ نہیں چل سکا ہے۔‘‘(۵)

وجودیت کے حوالے سے ایک مثال کے لیے غالب کے ایک شعر کو لیتے ہیں:

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

اس کا سیدھا سیدھا ترجمہ یا مطلب یہ بنتا ہے کہ نقش (جو کاغذ پہ بنتا ہے فریادی ہے خوبصورت تحریر کا کہ ہر تصویر نے کاغذی لباس پہنا ہوا ہے۔عبدالرزاق شاکر کے نام خط میں خود غالب نے اس کی تشریح کی کہ ’’کاغذی پیرہن‘‘ قدیم ایران میں کاغذی لباس پہن کر فریادی‘ فریاد لے کر بادشاہ کے پاس حاضر ہوتا کہ اس کی داد رسی کی جائے۔یعنی یہ ’’کاغذی لباس‘‘ تلمیح ہے تصویر بذاتِ خود علامت ہے ’’کسمپرسی‘‘ کی ’’بے مائیگی کی‘‘ اور ’’بے چارگی‘‘ کی جیسے:

رات مجلس میں تری ہم بھی کھڑے تھے چپکے
جیسے تصویر لگا دے کوئی دیوار کے ساتھ (میرؔ)

غالب کے شعر پر غور کیجئے وہ وجودی فکر رکھتے تھے بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ ’’وجودی فکر‘‘ کے امام میں غالب سے پہلے جذبہ غالب تھا وہ کہتے ہیں ہر شخص اپنے خالق سے یعنی ہر نقش اپنے مصور سے فریاد کناں ہے کہ اُسے وجود ملنا دراصل کشمکش ہے گھاٹے کا سودا ہے کہ اگر مر ہی جانا ہے تو پھر اس کی بقا کے لیے انسان سر دھڑ کی بازی کیوں لگائے۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

گویا صرف اللہ ہی تھا اور رہے گا باقی سب فنا ہو جانے والا ہے اور باقی اس کی ذات ہی ہوگی۔ وجودیت کا ایک حصہ یا نام ’’احدیت‘‘(Monoism) ہے کہ حقیقت ایک ہے حقیقت عظمیٰ ایک ہی ہے باقی سب واہمہ ہے‘ سایہ ہے‘ عکس ہے اصل حقیقت‘ اصل کچھ اور ہے بقول میر: ؎

یہ توہم کا کارخانہ ہے
یہاں وہی ہے جو اعتبار کیا

اللہ کُل ہے باقی جزو‘ تضاد اور کشمکش ہی تو ہے کہ مرنے کے لیے کوئی بھی تیار نہیں خواہ مصائب کتنے ہی کیوں نہ ہوں وجود بہر حال ’’آزار‘‘ ہے کہ اگر بے حس تصویر بھی فریاد کرتی ہے نوحہ کناں ہے تو

وجودرکھنے والے کیا مصیبت میں ہوں گے۔

مشرقی ادب میں وجودیت تصوف (فلسفہ وحدت الوجود) کی طرف راہ اختیار کرتی ہے اور مغربی ادبیات میں وجودیت کی بڑی اقسام میں سے ''مذہبی وجودیت'' اور ''ملحدانہ وجودیت'' ہے اور یہاں اسے فلسفے کی طرز پر زیادہ سمجھا جاتا ہے، جس کی بنیاد کرکیگارڈ نے رکھی، جس میں آگے جا کر اختلافات اور معمولی ردّوبدل سامنے آتے رہے۔ سورین کے بقول مذہب/الٰہیات کو عقل کی مدد سے نہیں سمجھ سکتے یہاں دو نظریوں کا ٹکراؤ ہے کہ ہیگل ''عقل کا پرستار'' ہے جب کہ سورین کے بقول ''عقل نارسا'' ہے کچھ کا خیال ہے کہ کائنات ''جوہر'' سے بنی ہے جب کہ اس سے اختلاف کرنے والوں کا کہنا ہے کہ کائنات ''مادہ'' سے بنی ہے۔ وجودی فکر رکھنے والے کہتے ہیں کہ ہمیں کائنات میں پھینک دیا گیا ہے۔

بے نشہ کس کو طاقتِ آشوبِ آگہی
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

مگر وجود سے ''آگہی'' ضروری ہے کہ وجود کے ساتھ ''شعور'' منسلک ہے اور شعور ہی سزا ہے کہ جب یہ بلندی کی طرف راغب کرتا ہے۔ اُٹھاتا ہے تو جنگ لڑنا پڑتی ہے انسان غایتی اور مقصدی انسان کی حیثیت رکھتا ہے کہ جہاں وہ نارسائی کو واضح دیکھتا ہے مگر اطلاقی ادراک سے ناواقف ہے۔ مغرب میں اس فلسفے کے تحت ادب میں انتہائی دکھ مایوسی اور تکلیف کا احساس ہے۔ ۱۹۴۵ء۔۱۹۳۹ء یعنی دوسری جنگِ عظیم کے دوران اسے دوام ملا۔ امریکہ اور خاص طور پر فرانس میں اسے شہرت نصیب ہوئی اور سارتر نے خاص طور پر اس کو زندہ کر دیا۔ ایران کے سٹوری رائٹر صادق ہدایت نے سارتر کے فلسفے کے تحت خودکشی کر لی تھی۔ اسی طرح گوئٹے کے ''فاؤسٹ'' میں فاؤسٹ ذہین ہے مگر پڑھ لکھ کر بھی ثمر حاصل نہیں کر پاتا تو انجام ''یاسیت'' کے سوا کچھ نہیں۔ بہ قول مغرب ''انسان خود کو بنانے میں بااختیار'' ہے جب کہ ہم اچھے یا برے بنے بنائے پر یقین رکھتے ہیں۔

کولن ولسن وجودیت کو روحانیت کے عین قرار دیتے ہوئے کہتا ہے کہ کرکیگارڈ اور نطشے رومان پسند تھے اور وجودی بھی۔ جدید وجودی تو فکری روّیہ رکھتے ہیں اور اُن کے یہاں وجودیت اپنا اصل کھو کر رومانیت کا عقلی چربہ بن گئی ہے۔ ولسن کا اس زاویہ نگاہ سے جائزہ لیں تو نتیجہ نکلتا ہے کہ وجودیت رومانیت نہیں محض اس کی ترقی یافتہ صورت ہے۔

ہر شے کو زوال ہے جس کا سب کہیں نہ کہیں پیدا ہو ہی جاتا ہے۔ وجودی فلسفے کے زوال کا اہم سبب یہ بھی ہے کہ کوئی بھی وجودی دانش ور یہ تسلیم نہیں کر سکتا کہ انسان سے خارج میں کوئی اقدار بھی موجود ہیں یعنی یہ کہ انسان کے روزمرہ شعور کے خارج میں سارتر یہ کہتا ہے کہ انسان مطلق آزاد ہے تو

کیا یہ سوال نہیں اُٹھتا کہ آزادی سے مراد کیا ہے اور ہمیں اس کو کس طرح استعمال میں لانا ہے مگر سارتر کا کہنا ہے کہ اس کا جواب یہ ہے کہ ہم اپنی مرضی کے مالک ہیں اور جو چاہیں کر سکتے ہیں تاہم جیسے ہر کسی کا فرض عملی طور پر کسی دوسرے کا فرضی خیال نہیں ہوتا لہٰذا کسی شے کی حقیقت کسی شے کی آزادی نہیں اور یہی وہ مقام ہے جہاں کولن ولسن کا مسئلہ سر اُٹھاتا ہے کہ فرد کو تو آزاد ہی سمجھا جائے مگر یہ دُنیا لایعنی ہے اور یہی سب سے وقیع اور اہم مسئلہ ہے۔

وجود کو جوہر پر مقدم خیال کیا گیا کیوں کہ روایتی فلسفے کے مطابق انسان سمیت ہر ایک شے کا رشتہ ''جوہر'' سے جڑا ہوا ہے اور وہ بھی اُس کے تخلیقی وقت سے ہی اور یہی وہ چیز ہے جو فرد کے افعال و حدود کا تعین کرتا ہے جس میں تبدیلی ناممکن ہے۔ وجودیت کے علمبرداروں میں مشرقی ادب میں ایک معتبر نام انیس ناگی کا ہے جن کی تحریریں اس فلسفے کی عکاس ہیں خاص طور پر

۱۔ میں اور وہ	۲۔ دیوار کے پیچھے	۳۔ چوہا دوڑ
۴۔ زوال	۵۔ ایک گرم موسم کی کہانی	۶۔ ایک لمحہ سوچ کا

شامل ہیں۔ ہمارے یہاں اُردو ادب میں اس تحریک کے زیادہ نہ پنپنے کی وجہ اس فلسفے کی صحیح تفہیم اور فکری نظریے سے اختلاف ہے۔ شہزاد احمد نے یہاں اسے فلسفہ کی رو سے بیان کیا ہے مگر بات بھی صحیح ہے کہ یہ فلسفہ یہاں شروع تو ہوا مگر خاطر خواہ کامیابی نہ حاصل کر سکا۔

حوالہ جات

۱۔ اسلم انصاری ڈاکٹر ''وجودی مفکروں کی اندوہ نگاری''مشمولہ ''دبستان'' شمارہ ۱، ۲۰۰۴ء ص ۳۴

۲۔ ایضاً

۳۔ محمد علی صدیقی ''ہائیڈیگر اور جدید اُردو ادب'' مجلّہ فنون، لاہور، نومبر، دسمبر، ۱۹۷۶ء، ص ۲۷

۴۔ ''وجودیت کیا ہے'' راوی لاہور، جلد ۶۱، شمارہ ۲، ص ص ۱۲، ۱۲

۵۔ قاضی جاوید ''وجودیت'' تخلیقات لاہور، ۱۹۹۸ء، ص ۱۱۳

سیاہ تِل

—دیوندر اِسّر—

دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی۔

میں نے دروازہ کھولا۔

باہر وہ کھڑا تھا۔ میں اُسے نہیں جانتا تھا۔

''پہچانا مجھے۔۔۔'' اُس نے سوال کیا۔

''نہیں شاید!'' مجھے یاد نہیں آ رہا تھا کہ وہ کون ہے، اسے کہاں دیکھا تھا شاید اُسے میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

''شملے میں ہماری ملاقات ہوئی تھی۔'' اُس نے کہا ''اُس روز بارش بڑے زوروں کی تھی اور ہم ایک سرائے میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے تھے۔''

''ہاں ہاں۔'' میں نے کہا لیکن مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔

''اندر آیئے۔'' میں نے کہا۔

وہ اندر آ گیا اور آرام کرسی پر بیٹھ گیا، اس نے جیب سے پائیپ نکالا اور دھیرے دھیرے اس میں تمباکو ڈالا اُس نے اپنی جیب میں ماچس تلاش کی لیکن اُس کے پاس ماچس نہیں تھی۔ میں نے اُسے سگریٹ لائٹر پیش کیا۔

''شکریہ!'' اُس نے کہا ''جب ہم شملے میں ملے تو تمہارے ساتھ ایک لڑکی تھی۔''

''لڑکی؟'' میں نے جیسے چونکتے ہوئے کہا ''مجھے نہ جانے کیوں یہ خیال آیا کہ شاید یہ آدمی مجھے بلیک میل کرنا چاہتا ہے۔ اُس کی شکل وصورت اور نقل وحرکت سے مجھے یہی شک گزرا۔''

''اب تمہاری یادداشت کافی کمزور ہوگئی ہے۔'' وہ بولا اُس کے لہجے میں طنز تھا۔

''یادکرو، ذہن پر ذرا زور ڈالو۔۔۔ایک سانولے رنگ کی چھریرے بدن والی لڑکی۔۔۔اور۔۔۔'' وہ اچانک خاموش ہوگیا۔

اب میں کس کس لڑکی کو یاد کروں سانولے رنگ چھریرے بدن والی لڑکی۔

''کوئی بات نہیں اور نشانی بتا تا ہوں۔۔۔اس کی گردن پر بائیں جانب ایک سیاہ تل بھی تھا۔۔۔'' اُس نے کہا۔

اب مجھے پورا یقین ہوگیا کہ وہ مجھے بلیک میل کرنا چاہتا ہے وہ اُس لڑکی کا ذکر اس انداز سے کررہا تھا جیسے وہ اُسے بہت ہی قریب سے جانتا ہے اور مجھے دھیرے دھیرے اپنے جال میں پھانس رہا ہے۔

میں نے صاف انکار کردیا۔

اس نے جیب سے کاغذ کا ایک ٹکڑا نکالا۔۔۔''اسے پہچانتے ہو!'' اب اس کی نگاہیں میرے چہرے پر گڑ گئی تھیں۔

اخبار کے اس پرزے پر ایک لڑکی کی تصویر تھی یہ کپڑوں کی کسی فرم کا اشتہار تھا۔

''ہاں! میں نے اِسے مختلف قسم کے اشتہاروں میں کئی بار دیکھا ہے شاید یہ ماڈل گرل ہے۔۔۔'' میں نے کہا۔

لیکن میں نے اِسے پہچان لیا تھا، یہ سونیا تھی۔

''تم اس لڑکی کو کیسے جانتے ہو؟'' میں نے اس سے سوال کیا میرا لہجہ جارحانہ تھا۔

''یہ نیچے بہت مہین حروف میں یہ نام پڑھ رہے ہو۔۔۔میں اس ایڈورٹائزنگ فرم کا منیجر ہوں۔''

''اوہ!'' میں نے سر ہلایا۔

''اس لڑکی کے خدوخال، نقوش اور چہرے میں ایک خاص قسم کا توازن ہے۔ میرے پسندیدہ ماڈلوں میں یہ سب سے زیادہ چارمنگ ہے۔'' اس نے پائیپ کا ایک لمبا کش لیتے ہوئے کہا وہ آرام کرسی کی بیک پر جھک گیا۔

''میں نے سینکڑوں اشتہار ڈیزائن کیے ہیں اور بیشتر اشتہاروں میں اس لڑکی نے ماڈل کیا ہے۔۔۔ایک روز۔۔۔اچانک میری نظر اس کی گردن کے سیاہ تل پر پڑ گئی۔ اس سے پیشتر بھی میں نے یہ تل دیکھا تھا لیکن اس روز اسٹوڈیو کی روشنی کچھ اس زاویے سے اس تل پر پڑی کہ یہ تل جیسے اس

کی شخصیت کا مرکزی نقطہ بن کر چمک اُٹھا۔

''لیکن اِن سب باتوں کا مجھ سے کیا تعلق ہے؟'' میں نے کہا۔

''دراصل ان سب باتوں کا مجھ سے بھی کوئی تعلق نہیں۔'' وہ بولا ''اس لیے کہ میں ایک پروفیشنل ہوں۔'' وہ تھوڑی دیر کے لیے رکا پھر بولا۔۔۔''اور میرا خیال تھا کہ میں محض ایک پروفیشنل ہوں لیکن میں اس لمحے کو کبھی نہیں بھولوں گا جب مجھے اچانک یہ محسوس ہوا کہ میں آدمی بھی ہوں۔۔۔میری زندگی میں کئی ماڈل آئے لیکن کسی نے مجھے یہ احساس نہیں دیا کہ میں آدمی بھی ہوں نرا پروفیشنل ہی نہیں تم جانتے ہونا ایڈورٹائیزر کا کام چیز بیچنا نہیں ہوتا چیز کے تصوّر کی اشاعت کرنا ہے۔''

''تم کہہ رہے تھے کہ اس کی گردن پر سیاہ تل تھا۔'' میں نے اُسے ٹوکا۔ میں اس آدمی سے جلد از جلد چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ میرے ذہن میں سونیا کی تصویر ایک Flash کے ساتھ اُبھری۔ سونیا کی گردن پر سیاہ تِل کتنا خوبصورت معلوم ہوتا تھا شاید اس کی کشش کا تمام تر راز اسی تل میں تھا۔ میرے پیار کی شدت کا اظہار ہی اس کے تِل کا لمس تھا لیکن سونیا بڑی ضدی لڑکی تھی۔ میں نے اس سے کئی بار کہا کہ تم یہ ماڈلنگ چھوڑ دو۔ مجھے تمہارے جسم کی یہ عجیب وغریب زاویوں میں اور کبھی کبھی نیم برہنگی کی حالت میں نمائش پسند نہیں لیکن ہر بار اس کا یہی جواب ہوتا کہ خوبصورتی کو گناہ کے تصور سے ملوث نہ کرو۔

''چلو اُٹھو۔۔۔میرے ساتھ چلو۔۔۔''اس آدمی نے اچانک کہا۔

''کہاں؟'' میں نے پوچھا۔

''جہاں میں لے جاؤں۔''

''پھر بھی۔''

''میں نے کہہ دیا نا! چلو میرے ساتھ۔۔۔''اس کی آواز میں درشتی تھی۔

میں جس حالت میں تھا اس کے ساتھ چل دیا مارکیٹ سے ہوتے ہوئے ہم بڑی سڑک پر آگئے۔ رات کے قریب گیارہ بجے تھے سڑکوں پر ٹریفک خال خال ہی نظر آتی تھی۔ بڑی سڑک سے ہٹ کر ہم ایک تنگ سڑک پر آگئے۔

''تم مجھے کہاں لیے جا رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ راستے بھر وہ خاموش چلتا رہا جیسے پستول کی نالی کی زد پر وہ مجھے کسی خفیہ مقام پر لیے جا رہا ہو۔ اب قبرستان کی چہار دیواری شروع ہو چکی تھی۔ گیٹ پر آکر وہ تھوڑی دیر کے لیے رُکا اور پھر اس کے اندر داخل ہو گیا۔

''قبرستان میں کہاں لیے جا رہے ہو۔۔۔اتنی رات گئے۔۔۔''میں نے کہا۔

اس نے پھر بھی کوئی جواب نہیں دیا چند قدم چل کر وہ ایک قبر کے پاس رک گیا۔ وہ قبر پر دوزانو بیٹھ گیا اور اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا۔ میں بھی دوزانو بیٹھ گیا اور اُس کی پیروی کرنے لگا۔

چنڈ منٹ وہ خاموش رہا۔ چرچ کی گھڑی نے شاید بارہ بجائے۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ جیب سے ٹارچ نکالی اور قبر پر ایستادہ پتھر پر روشنی ڈالی۔

''سونیا۔۔۔''میں چلایا۔

قبر پر لکھا تھا۔۔۔''سونیا۔۔۔۱۹۵۰ء۔۔۔۱۹۷۰ء''

''کیا سونیا مر گئی؟''میں نے آہستہ سے کہا حالانکہ یہ سوال بڑا بے محل تھا۔

''ہاں۔۔۔ میں نے سونیا کو مار دیا ہے۔'' وہ بڑی نرمی سے بولا۔ یہ آدمی اس آدمی سے مختلف تھا جو مجھے یہاں تک لایا تھا۔

''تم۔۔۔تم نے سونیا کا قتل کیا ہے؟ ظالم، گناہ گار۔۔۔''میں نے کہا۔

''اور تم نے بھی۔۔۔ہم دونوں سونیا کے قاتل ہیں۔''

وہ تھوڑی دیر خاموش رہا پھر بولا۔۔۔''چلو واپس چلیں۔'' اور اس نے میرا بازو تھام لیا اور کہنے لگا۔

''ایک دِن میں سونیا کی تصویریں لے رہا تھا نیل پالش کے ایک بڑے Prestage اشتہار کے لیے۔۔۔اس کی لمبی لمبی اُنگلیاں مخملیں کپڑوں پر حرکت کر رہی تھیں۔ گٹار کے تاروں پر لرز رہی تھیں اور میں تصویریں لیے جا رہا تھا اچانک اس نے اپنی اُنگلیاں اپنی گردن پر رکھ لیں بالکل وہیں جہاں اس کی گردن پر سیاہ تل تھا اور اس نے ایک لمبی سانس لی اتنا مسحور کن چہرہ اتنی پرکشش ادا میں نے زندگی بھر نہیں دیکھی تھی۔''پلیز ویٹ، جسٹ اے منٹ، وَن بشاٹ اینڈ ویٹ اِز ڈن۔''

''تو باس! تم اس تل کی تصویر نہیں لے سکتے یہ اشتہار کے لیے نہیں۔''اس نے کہا میں نے بڑا اصرار کیا لیکن اس نے انکار کر دیا۔۔۔اس سے میری کئی یادیں وابستہ ہیں یہ میرا عزیز ترین سرمایہ ہے۔۔۔اس نے کہا تھا غصے میں آکر میں نے اس کا کنٹریکٹ کینسل کر دیا۔ اس نے کنٹریکٹ کی خلاف ورزی کی تھی۔ میں نے کہا''میں تمہارا کیریر برباد کر دوں گا۔''

اس نے کہا۔۔۔''بے شک۔''

اور میں نے واقعی اس کا کیریر برباد کر دیا۔ عدالت نے اس کے خلاف فیصلہ دیا اُسے ہرجانہ دینا تھا یا دوسری صورت میں اُسے میرے ماضی کے مطابق تصویر کھچوانی پڑتی۔۔۔''ہرجانے کے پیسے

اُس کے پاس تھے نہیں۔۔۔لہٰذا۔۔۔''

''پھر؟''

''پھراس کی تصویرجیسا کہ میں نے چاہا لے لی۔۔۔وہ اشتہار شاہکار ثابت ہوا۔۔۔سونیا کو پہلے سے زیادہ کنٹریکٹ ملتے گئے لیکن۔۔۔''

''لیکن۔۔۔؟''میں نے پوچھا۔

''اس کے بعد سونیا کی کوئی تصویر نہیں چھپی۔اچانک اس نے تمام کنٹریکٹ کینسل کردیے تھے۔''

''لیکن؟''میرے سوال کا جواب ابھی نہیں ملا۔

''لیکن کیا؟ اُس تصویر کے بعد اس نے اُنہیں اُنگلیوں سے اپنی جان لے لی۔۔۔ جو اُنگلیاں۔۔۔''اوراُس نے ایک تصویر میرے ہاتھ میں دے دی۔

یہ سونیا کی تصویر تھی۔گردن کے سیاہ تل پر لمبی لمبی چمکتے ناخنوں والی اُنگلیوں کے نرم لمس تھے۔۔۔''

لیکن کیا سونیا واقعی محض ایک پروفیشنل ماڈل تھی۔میرے دِل نے جیسے مجھ سے سوال کیا۔

''میں سونیا کو جانتا ہوں، بہت قریب سے۔''میں نے اعتراف کیا''میں نے سونیا کو قتل کیا ہے۔''

وہ کچھ نہیں بولا۔۔۔ہم قبرستان سے باہر نکل چکے تھے۔سڑکیں اسی طرح ناآسودہ بانہوں کی طرح دُور تک پھیلتی چلی جارہی تھیں اور ہم دونوں موٹی دھار کی طرح اس پر بہتے چلے جارہے تھے۔۔۔جہاں لہو ریت میں جذب ہو جاتا ہے۔

OOO

دستاویز

-مظہرالزماں خان-

تصدیق نامہ۔۔۔

تمسک مناطہ دعویٰ۔۔۔

تاریخ؟۔۔۔

دِن۔۔۔ایام

موسم۔۔۔(کوئی بھی نہیں)

بادشاہت/صدارت؟

پہلا مقدمہ۔۔۔آخری مقدمہ۔۔۔

انصاف۔۔۔(باقی ہے)

۔۔۔شور ہی شور۔۔۔

آرڈر، آرڈر اس قدر شور عدالت کے اصول کے خلاف ہے کہ یہ انصاف گاہ ہے۔ یہاں سچ اور جھوٹ کا فیصلہ ہوتا ہے اور آداب کا خیال رکھا جاتا ہے۔

''یور آنر۔ اس شور سے عدالت عالیہ میں موجود کسی بھی فرد کا کوئی تعلق نہیں ہے کہ یہ شور تو عدالت کے اطراف پھیلے ہوئے بے شمار پیپل، برگد، ببول، جامن، شیشم اور نیم کے درختوں پر الٹی لٹکتی ہوئی ان ہزار ہا چمگادڑوں کا ہے جو اپنے سیاہ لباس میں دن رات ان درختوں پر جھولتی رہتی ہیں جیسے صدیوں سے انصاف جھول رہا ہے شاید جناب عالی نے کبھی ان کی آوازوں کی طرف توجہ نہیں دی ورنہ یہ آوازیں صبح سے رات تک سنائی دیتی ہیں۔ اکثر جب بغیر کسی فیصلے کے عدالت کا وقت ختم ہو جاتا ہے اس وقت یہ چمگادڑیں اپنی مکروہ آوازوں سے زمین اور آسمان سر پر اُٹھا لیتی ہیں جیسے انصاف کا ماتم

کررہی ہیں کہ یہ بوڑھی حرافہ زمین کی کہانی ہے جن پر ہم جیسے یا مجھ جیسے عیار گج مج بستے ہیں اگر ان چھتنار درختوں کو کٹوا دیا جائے تو شاید یہ کہانی بے اثر اور بے آواز ہو جائے کہ آواز ہی بہت اہم ہے اگر وہ چھن جائے تو زمین ہی گونگی ہو جائے گی اور پھر ان درختوں کو کٹوانے کے لیے کسی کاغذی لباس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ صرف زبانی حکم ہی کافی ہوگا اور پھر آج کل تو بیمار کاغذی حکم ناموں سے زیادہ زبانی حکم ہی چل رہے ہیں لہٰذا زبانی حکم ہی دیا جائے کیوں کہ زبانی حکم کی کوئی سند نہیں ہوتی ویسے کسی بھی سند کی ان دنوں کوئی اہمیت باقی نہیں رہی۔

''ٹھیک ہے، مجسٹریٹ نے کہا'' ہم ایسا ہی کریں گے کہ ہم ایسا ہی کرنے کے عادی ہیں۔ اس شور سے عدالت عالیہ کا بے حد قیمتی وقت برباد ہو رہا ہے لیکن ہم نے سنا ہے کہ عدالت کے اندر بھی چمگادڑوں نے اپنے گھر بنا لیے ہیں مگر ان چمگادڑوں کو کہیں کسی نے دیکھا نہیں۔

یس یور آنر: لیکن یقین سے کہا نہیں جا سکتا کہ ایسا ہے مگر اس بات پر کوئی تصدیق نہیں کرے گا کہ چمگادڑیں موجود نہیں ہیں'' اس تعلق سے ہم اگلی صدی میں غور کریں گے کہ اس صدی میں ہمارے پاس غور کرنے کے لیے وقت نہیں ہے۔ اب کارروائی شروع کی جائے کہ یہ بہت اہم مقدمہ ہے کہ یہ مسلسل چل رہا ہے اور آج تک کوئی فیصلہ نہ ہو سکا کہ یہ دھاگے کے گچ گچ پھندے کی طرح ہو کر رہ گیا ہے کہ اس کا کوئی سرا ملتا ہی نہیں اور اب بیسویں صدی ختم ہو چکی ہے اور اکیسویں صدی کا چہرہ بھی صاف نہیں ہے۔ خیر مقدمہ شروع کیا جائے کہ وقت خواہ مخواہ ضائع ہو رہا ہے۔

''یور آنر: میں کہہ رہا تھا کہ یہ مجرم جو عدالت کے کٹہرے میں چپ چاپ کھڑا ہوا ہے ایک ایسا سفاک اور بے رحم قاتل ہے کہ اس کی مثال اس پوری زمین پر کہیں نہیں ملتی کیونکہ اس نے ایک بے قصور، معصوم اور نہایت خوبصورت اور بے داغ انسان کے جسم کو اس بے دردی سے چھلنی کر دیا کہ مقتول کے جسم کا کوئی عضو سلامت نہیں رہا لہٰذا عدالت سے میری التجا ہے کہ اپنے سابقہ انصاف کو برقرار رکھتے ہوئے قاتل کو ایسی عبرتناک سزا دے کہ ساری انسانیت، بشرطیکہ انسانیت موجود ہو، کانپ اُٹھے۔''

''تمہیں اپنی صفائی میں اگر کچھ کہنا ہے تو کہہ سکتے ہو کہ عدالت تمہیں اس کی اجازت دیتی ہے۔'' مجسٹریٹ نے مجرم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اپنی صفائی میں بھلا میں اب مزید کیا کہہ سکتا ہوں یور آنر، میرا تو بس ایک ہی کہنا ہے جو میں مسلسل کہہ رہا ہوں کہ میں نے یہ قتل نہیں کیا اور میں بے قصور ہوں لیکن کوئی میری سنتا ہی نہیں جب کہ میرے وکیل صفائی نے بھی صاف طور پر اور بار بار عدالت سے یہی درخواست کی ہے کہ میں قاتل نہیں ہوں۔

''پھر تمہاری اُنگلیوں کے نشانات ان ہتھیاروں پر کیسے پائے گئے جن سے تم نے قتل کیا ہے
وکیل سرکاری نے کہا ''یور آنر ایک اور اہم بات یہ ہے کہ جن ہتھیاروں سے مجرم نے قتل کیا ہے ان ہتھیاروں پر بڑی عجیب وغریب زبان لکھی ہوئی ہے جسے کوئی پڑھ نہیں سکتا کہ دُنیا کے تمام ماہر لسانیت دیکھ چکے ہیں ان ہتھیاروں پر لکھی زبان کسی کی سمجھ ہی میں نہیں آتی پتہ نہیں یہ کون سی زبان ہے کس ملک اور قوم کی ہے کہ جسے دُنیا کا کوئی بھی فرد پڑھ ہی نہیں سکتا اور انہیں ہتھیاروں سے مجرم نے ایک نہایت خوبصورت اور معصوم جسم کو چھلنی کیا ہے لہٰذا عدالت سے میں پھر درخواست کرتا ہوں کہ قاتل کو سخت سے سخت سزا دی جائے۔

''یور آنر: میں عدالت سے ایک بار پھر التجا کرتا ہوں کہ عدالت مجھے سزا دے کر اپنا دامن خون آلودہ نہ کرلے کہ یہ دُھل ہی نہ سکے گا اور پھر پھیلتا ہی جائے گا اور اتنا پھیلے گا اتنا پھیلے گا کہ انصاف کا چہرہ ہی باقی نہیں رہے گا بے شک ان ہتھیاروں پر میری اُنگلیوں کے نشانات پائے گئے ہیں لیکن میری ہی اُنگلیوں کے نشانات کی طرح سبھوں کی اُنگلیوں کے نشانات بھی ان ہتھیاروں پر موجود ہیں کہ آج ہم سبھوں کے ہاتھ ایک جیسے ہی ہو چکے ہیں اور اگر میری بات پر یقین نہ آئے تو سب سے پہلے وکیل سرکاری کی اُنگلیوں کے فنگر پرنٹ بھی نکال کر دیکھے جائیں اور میرا یہ دعویٰ ہے کہ اس قتل میں وکیل سرکاری بھی شامل ہیں میری عدالت سے یہ گزارش ہے کہ وہ وکیل سرکاری کے فنگر پرنٹ بھی نکال کر دیکھ لیں۔

''یہ ناممکن ہے اور ایک مہذب وکیل پر جھوٹا الزام ہے کیونکہ دُنیا میں کسی بھی شخص کی اُنگلیوں کی لکیریں کسی اور شخص کی لکیروں سے مل ہی نہیں سکتیں عدالت تمہاری اس دلیل کو تسلیم نہیں کرسکتی۔''

''مجھے مکمل یقین ہے یور آنر کہ ان ہتھیاروں پر میرے ساتھ وکیل سرکاری کی اُنگلیوں کے نشانات بھی موجود ہیں اگر عدالت کو میرے اس دعوے پر شک وشبہ ہے تو وکیل سرکاری کے فنگر پرنٹ بھی دیکھ لیں اور اگر میری بات غلط ثابت ہو جائے تو عدالت مجھے جو چاہے سزا دے۔''

ایک بار پھر عدالت میں شور سا اُٹھا۔ ان درختوں کو فوراً کٹوا دیا جائے کہ چمگادڑوں کی آوازیں عدالت کا قیمتی وقت خراب کر رہی ہیں اور عدالت کا وقت خراب کرنا، عدالت کو خراب کرنے کے برابر ہے۔

''تم جانتے ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' مجسٹریٹ نے گرجدار آواز میں کہا۔

''یس یور آنر میں یہ اچھی طرح جانتا ہوں کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ ایک سنگین جرم ہے لیکن عدالت سے میری التجا ہے کہ وکیل سرکاری کے فنگر پرنٹ بھی ملاحظہ فرمائیں۔''

''یہ سراسر ایک الزام ہے ہز ہائی نس (His Highness) مجرم خواہ مخواہ عدالت کا وقت برباد کر رہا ہے اور جو الزام مجرم نے مجھ پر لگایا ہے وہ قانون کے ایک محافظ کا مذاق اور توہین عدالت وانصاف ہے کیونکہ یہ جس کو جہاں چاہیں اور جب چاہیں پیدا کرنے اور مجرم قرار دینے کے برابر ہے اور یہی کچھ مسلسل ہو رہا ہے کہ مجرمین جب جی چاہا اپنے چہرے پر کسی کا بھی چہرہ لگا رہے ہیں حتیٰ کے نصاب اور تاریخ کی کتابوں کے علاوہ شہروں اور ملکوں بلکہ لفظوں کی شکلیں تک بدلی جا رہی ہیں تاہم اگر مجرم کی یہی خواہش ہے تو میں اپنی اُنگلیوں کے نشانات اسی وقت پیش کرتا ہوں۔'' چنانچہ وکیل سرکاری کے فنگر پرنٹ نکالے گئی اور پھر عدالت عالیہ کے سامنے پیش کئے گئے تو سبھوں نے اپنی اپنی اُنگلیوں کو اپنے اپنے دانتوں میں دبا لیا کہ ان ہتھیاروں پر پائے جانے والے سرکاری وکیل کی اُنگلیوں کے نشانات بھی ہوبہو قاتل کی اُنگلیوں کے نشانات جیسے ہی تھے۔ رائی برابر بھی فرق نہ تھا چنانچہ وکیل سرکاری کو بھی کٹہرے میں کھڑا کر دیا گیا تو کٹہرا کچھ اور پھیل گیا کہ جب بھی کسی مجرم کو کٹہرے میں لایا جاتا کٹہرا آپ ہی آپ پھیل جاتا تھا۔

''یور آنر یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک آدمی کے ہاتھوں کے نشانات دوسرے آدمی کے ہاتھوں کے نشانات ایک جیسے ہی ہوں آج تک ہم نے ایسا کہیں دیکھا اور نہ سنا مگر ایسا ہوا ہے اور ایسا ہو جانا ہم سبھوں کے لیے بڑے تعجب اور فکر کی بات ہے نئے سرکاری وکیل نے کہا تو کٹہرے میں کھڑے ہوئے پہلے وکیلِ سرکاری نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا یور آنر اگر میرے فنگر پرنٹ قاتل کے فنگر پرنٹ سے میل کھاتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ نہ صرف میرے بلکہ مہذب وکیل سرکاری اور وکیلِ صفائی کے ساتھ ساتھ تمام گواہوں کے فنگر پرنٹ بھی نکال کر دیکھے جائیں کہ ہم میں سے کون کون اس قتل میں شامل ہے کیونکہ مجھے بھی سارے وکلاء اور تمام گواہوں پر شک ہے لہٰذا میں عدالت سے درخواست کرتا ہوں کہ جس طرح میرے فنگر پرنٹ لیے گئے ہیں۔ اسی طرح عدالت میں موجود سبھوں کے فنگر پرنٹ بھی نکالے جائیں کہ یہ بے حد ضروری ہے کیونکہ یہ مقدمہ اب نیا موڑ اختیار کر چکا ہے اور اس موڑ اور راستے پر ہم سب چل رہے ہیں جو مزبح کی طرف جاتا ہے عدالت میں پھر ایک زبردست شور اُٹھا جو چمگادڑوں کے شور کے ساتھ مل کر پوری عدالت میں پھیل گیا تھا۔

''آرڈر۔۔۔ آرڈر! مجسٹریٹ نے بلند لیکن لرزتی ہوئی آواز میں کہا عدالت یہ حکم دیتی ہے کہ نہ صرف عدالت میں موجود افراد بلکہ تمام شہریوں، وزیروں وغیرہ وغیرہ کے فنگر پرنٹ نکالے جائیں کیونکہ مقتول کا خون اب تمام ہاتھوں پر دکھائی دے رہا ہے کہ اب ہر ہاتھ مشکوک ہو گیا ہے۔''

اور پھر ایک کے بعد ایک سبھوں کے فنگر پرنٹ لیے گئے تو سبھوں کی اُنگلیوں کے نشانات

ہو بہو قاتل کی اُنگلیوں کے نشانات ہی کی طرح تھے چنانچہ سبھوں کو کٹہرے میں لاکر کھڑا کردیا گیا تو کٹہرا پھیلتے پھیلتے تقریباً زمین کو گھیر چکا تھا اور اب صرف مجسٹریٹ کے فنگر پرنٹ باقی تھے لہٰذا تمام مجرمین کی خواہش کے مطابق مجسٹریٹ کے فنگر پرنٹ بھی نکالے گئے تو وہ بھی ہو بہو قاتل کے فنگر پرنٹ جیسے ہی تھے چنانچہ مجسٹریٹ نے اپنا گاؤن اُتار کر آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھی عورت کے سفید جسم پر ڈال دیا اور بڑی رِقت انگیز آواز میں کہا ہم سبھوں کے ہاتھوں کی لکیریں قاتل کے ہاتھوں کی لکیروں ہی کی طرح ہوگئی ہیں لیکن یہ ایسی کیوں ہوگئی ہیں ہم میں سے کوئی بھی نہیں جانتا اور نہ ان ہتھیاروں پر لکھی زبان ہی ہم میں سے کوئی جانتا ہے لہٰذا اب میں کوئی فیصلہ نہیں کرسکتا کہ حکم اور فیصلہ مجھ سے چھن گیا ہے چنانچہ وہ آئے گا جس نے کہا تھا کہ وہی پہلا پتھر اُٹھائے جس نے زندگی میں کبھی کوئی گناہ نہ کیا ہوتا ہم میں صرف اتنا کہوں گا کہ ان ہتھیاروں کو پھانسی دی جائے جن کی کوئی زبان نہیں جانتا اور جو حقیقی معنوں میں مجرم ہیں اور اگر انہیں پھانسی نہ دی گئی تو یہ ہتھیار ایک دن پوری زمین کو قتل کردیں گے اور پھر چمگادڑوں نے اپنی آوازوں سے آسمان سر پر اُٹھالیا تو بادلوں کے دل کے دل پگھلنے لگے تھے۔

OOO

اُلٹے پاؤں

—محمد حامد سراج—

ہمارے پاؤں الٹے تھے فقط چلنے سے کیا ہوتا
بہت آگے گئے لیکن بہت پیچھے نکل آئے

عجیب کسلمندی سی رچی تھی اس کی طبیعت میں۔۔۔جانے سفر پر نکلنا اس کے مزاج پر اتنا گراں کیوں گزرتا تھا۔ایک گھریلو مصروفیت کی وجہ سے اسے میانوالی سے ملتان تک ہی تو جانا تھا۔تمام بڑے شہر اس کے گاؤں سے قریباً تین ساڑھے تین سو کلومیٹر کی مسافت پر تھے۔لاہور اور ملتان تین سو پچاس کلومیٹر اور راولپنڈی اسلام آباد دو سو اسّی کلومیٹر کی دوری پر تھے۔وہ گھر سے ایک دوست کے ساتھ موٹر سائیکل پر نکلا اور دوست سے کہا کہ میانوالی سے ملتان جانے والی شاہراہ پر وہ اسے ''گولے والا'' سٹاپ پر چھوڑ آئے تا کہ وہ وہاں سے بس پکڑ سکے۔موٹر سائیکل پر بیٹھتے ہی اسے خیال آیا میں تو ہمیشہ سے سفر میں ہوں۔زندگی ایک سفر ہے جس روز پیدا ہوا تھا اسی دن سے یہ سفر جاری ہے وقت کی آری عمر کو کاٹتی چلی جا رہی ہے۔ایک روز یہ درخت دھڑام سے زمین پر آ رہے گا اور دیمک کی خوراک بن جائے گا۔یہ روز کا سفر بھی بھلا کبھی اس کائنات میں تھما ہے۔آنکھ کھلنے پر مشقت کا سفر کھینچنا اور رات گئے چارپائی پر چند گھنٹوں کا آرام، وہ بھی نصیب میں ہو تو وگرنہ موجودہ نسلِ انسانی جو زمین پر سانس کھینچ رہی ہے وہ نیند کی ادویہ کے سہارے مصنوعی نیند لیتی ہے۔۔۔

یہ ''گولے والا'' ہے بڑی شاہراہ پر ایک چھوٹا سا قصباتی سٹاپ، تین چار چھپر ہوٹل، مشرقی سمت ایک چھپر کے نیچے کسی نے لقمہ کمانے کے لیے بلیرڈ ٹیبل لگا رکھی ہے جس پر پاس کے دیہات سے یا وہ ٹیکسی ڈرائیور جو گولے والا سٹاپ پر سارا دن سواری کا انتظار کھینچتے ہیں، بلیرڈ کھیلتے نظر آتے ہیں۔ساتھ میں ایک کارڈیلر کی دکان ہے جس میں وہ سارا دن نوگیٹی یا لُڈو کھیلتے ہیں۔اِکّا دُکّا دکانیں

منیاری کی بھی ہیں۔موٹر سائیکل پر اسے جو دوست چھوڑنے آیا تھا۔وہ اسی لمحے اسے اُتار کر واپس مڑ گیا تھا۔اس نے شاہراہ پر شمال سے جنوب جانے والی گاڑیوں پر نظر رکھنے کے لیے ایک ایسے چھپر ہوٹل کا انتخاب کیا جہاں ٹوٹی چار پائی پر بیٹھا وہ چائے سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ شمالی سمت سے آنے والی ٹریفک پر نظر بھی رکھ سکتا تھا۔اس نے چائے کی ایک پیالی کا کہا اور چار پائی کے کونے پر ٹک گیا۔

''گولے والا سٹاپ'' پر تیز میٹھے اور تیز پتی والی چائے کے دوران اسے وہ پاگل بھی یاد آیا جو ایک پتھر ہاتھ میں تولے سارا دن گھومتا رہتا تھا۔۔منہ سے ٹپکتی رالیں، میلے چیکٹ کپڑے، چند مخصوص جملے۔۔۔جو اس کا معمول تھے۔

''سارے شیشے توڑ دوں گا۔۔۔''

''ٹریفک جام کر کے رکھ دوں گا۔۔۔''

''پاکستان کی پولیس کو بحرا لکاہل میں ڈبو دوں گا۔''

''یہ دوائی کس ''کریانہ سٹور'' سے ملتی ہے۔۔۔؟''

''یہ پتھر دیکھ رہے ہو۔۔۔یہ بم ہے۔۔۔بم۔۔۔کوئی میرے قریب تو آ کے دیکھے۔۔۔مار دوں گا۔۔۔''

''گولے والا، میری ریاست ہے کوئی اور مائی کا لعل آ کے تو دیکھے۔۔۔بم مار دوں گا۔۔۔ اس پر صرف میرا سکہ چلے گا کیوں کہ میرے پاس پتھر ہے۔۔۔!''

ایم اے پاس وہ پاگل جو ایک شب اپنی جان بلب بیٹی کے لیے گھر سے دوائی لینے کو نکلا تھا، اسی لمحے کہیں قریبی گھر سے پولیس نے چھاپہ مار کر چند جواریوں کو پکڑا اور گلی میں جاتے اسے دیکھ کر اس کی ہر دلیل کو نظر انداز کر کے اسے گاڑی میں پھینک ''دارالامن'' لے گئے۔اس کی خوب خاطر تواضع کی گئی۔تیسرے روز جب اسے رہا کیا گیا تو اس وقت تک اس کی بیٹی زندگی سے رہائی پا چکی تھی۔۔۔وہ بھی اسی لمحے حواس سے رہائی پا کے گلیوں اور بازاروں میں کاغذ چُننے لگا۔کاغذ کے ہر ٹکڑے پر اس کی بیٹی کا نسخہ لکھا تھا۔۔۔وہی بم جو وہ ہاتھ میں تولتا پھرتا تھا اس کی کیا جان لیتا ایک صبح اس نے ملتان سے آنے والی کوچ جو گولے والا سے گزر رہی تھی اس پر پتھر تولا، شاید ڈرائیور نیا تھا جسے اس پاگل سے شناسائی نہ تھی، اس نے پاگل کے بچانے کو سٹیرنگ داہنی جانب کاٹا اور سامنے سے آنے والی بہتّر سیٹر بس سے جا ٹکرایا۔۔۔دھماکے کی آواز دور دور تک سنی گئی، بائیس جانیں چلی گئیں، بائیس گھر اُجڑ گئے لیکن وہ تو پاگل تھا، اسے کیا معلوم کیا حادثہ گزر رہا ہے۔۔۔اسے پولیس پکڑ لے گئی۔۔۔

میرے خیال میں یہ جو سامنے سے بس آ رہی ہے، جس کا ماتھا سجا ہوا ہے اور چمک رہا ہے یہ

وہی بس ہے جس کا مجھے انتظار ہے، ڈرائیور کا ہاتھ مسلسل ہارن پر ہے اور ہارن اس بات کی علامت ہے کہ بس میں سیٹیں خالی ہیں۔۔۔

''دیکھیے نا۔۔۔میں نے چھپر ہوٹل کے نیچے بیٹھ کر آپ سے باتیں کی ہیں۔۔آیئے آپ بھی میرے ساتھ چلئے آپ بور نہیں ہوں گے۔۔۔''بریک لگنے کی چر چراہٹ،فرنٹ ڈور کا ڈنڈا تھامے آدھا باہر لٹکتا کنڈیکٹر،اس کی آواز کی لیک،سرائے مہاجر، چوک اعظم، چوک منڈا،مظفر گڑھ،ملتان اے۔۔۔!

''استاد جی۔۔ایک سواری ہے۔''

''یار میں نے ملتان جانا ہے۔''

''آؤ جی آؤ۔۔۔ڈرائیور کی پیچھے والی سیٹ پر بیٹھو۔۔۔''اس نے ایک سواری جسے قریباً بیس کلومیٹر بعد چاندنی چوک اُترنا تھا، وہاں سے اُٹھ کے پیچھے جا بیٹھنے کو کہا،سواری نے برا سا منہ بنایا اور ناگواری سے اٹھ کر پچھلی سیٹ پر جا بیٹھا۔۔۔وہ ڈرائیور سے پچھلی سیٹ پر جم کے بیٹھا اور خیالوں میں کھونے سے پہلے گردوپیش پر نظر ڈالی۔ڈرائیور کے بال تیل سے چپڑے ہوئے اور مانگ درمیان سے نکلی ہوئی، خشخشی ڈاڑھی کو اس نے خوب جما کر بٹھایا ہوا تھا، بائیں ہاتھ کی انگلیوں میں اس نے موٹے نگ والی تین انگوٹھیاں پہن رکھی تھیں، آنکھوں میں سرمے کی دھاریں۔۔۔کنڈیکٹر نکلتے ہوئے قد کا ایک کرخت خال وخد کا نوجوان تھا،شیو بڑھی ہوئی،دائیں کان میں پیلے رنگ کی بال پوائنٹ اس نے اڑس رکھی تھی، کپڑوں کا رنگ میل خورا، جوتی پھٹی ہوئی۔۔۔ساتھ میں ایک ہیلپر بھی تھا۔۔ایک پندرہ سولہ سال کا بچہ، چہرے پر تکان اور نیند سے بوجھل آنکھیں،اس کے کپڑوں اور گردن پر جمی میل کا رنگ ایک سا تھا۔لگتا تھا اسے بستر سے کھینچ کر بس میں ڈال لیا گیا۔

چاندنی چوک کے سٹاپ پر کچھ سواریاں اُتریں کچھ نئے مسافر ہمسفر ہوئے۔۔۔بس چلتی رہی۔۔۔یہ ایک ریگستانی پٹی ہے،سرائے مہاجر کے بعد ایک جگہ اچانک بس رکی، ڈرائیور چھلانگ لگا کے اُترا اور سڑک پار کر کے جھاڑیوں کی اوٹ میں چلا گیا۔

''استاد کہاں گیا۔۔۔؟''

''پیشاب کرنے گیا ہے۔۔۔''

ایک ایک کر کے سواریاں بس سے اُتریں اور جھاڑیوں کی اوٹ میں چلی گئیں۔۔۔

اس موئے ڈرائیور کو میں نے کہا تھا کہ بچے نے پیشاب کرنا ہے اس وقت گاڑی نہیں روکی۔

ہیلپر۔۔۔جسے کنڈیکٹر''چھوٹا'' کہہ کر پکارتا تھا۔۔

''اوئے چھوٹے'' ٹائر ٹھوک بجا کے دیکھ لے۔۔۔

سواریاں واپس بیٹھ چکی تھیں، چھوٹے نے سارے ٹائروں کوٹھوک بجا کے دیکھا اور آواز لگائی۔۔۔''استاد ڈبل اے۔۔۔''

یہ ''چوک اعظم'' کا ایک ٹرک اڈہ ہوٹل ہے۔۔۔سفر کے دوران سارے ہوٹل ایک سے ہوتے ہیں۔۔ایسے ہوٹلوں پر مناسب داموں میں کھانا کھایا جا سکتا ہے، چائے پی جا سکتی ہے، کشادہ برآمدوں میں بچھی بڑی بڑی چار پائیوں پر کمر سیدھی کی جا سکتی ہے۔ پاکستان میں سفر کے دوران کچھ شاہراہوں پر سواریوں کی جیب خالی کرنے کے لیے لگژری ہوٹلوں کا قیام عمل میں آیا لیکن وہاں اِکّا دُکّا کاریں ہی کھڑی دیکھنے کو ملتی ہیں۔۔۔عوامی ہوٹلوں کا آباد ہونا ہماری سادگی اور سفید پوشی کا مظہر ہے۔ہم ایک ترقی پذیر ملک کے شہری ہیں۔۔۔

''آپ کے چہرے کے آثار بتا رہے ہیں کہ آپ اُکتاہٹ کا شکار ہونے لگے ہیں۔۔۔''

''دیکھیے آدھا سفر مکمل ہوا۔۔۔آدھا باقی ہے۔۔۔تھکاوٹ تو سفر میں ہو جاتی ہے۔۔۔منزل پر پہنچ کر سانس لے لیں گے۔''

اب ایک نیا موڑ ہے۔۔۔ذرا جھانک کر تو دیکھیے۔۔۔! پیٹ پوجا کے بعد سواریاں اپنی اپنی سیٹ پر اطمینان سے بیٹھی ڈرائیور کا انتظار کر رہی ہیں ایک دو مسافر ابھی بس کے ساتھ ٹیک لگائے سگریٹ پی رہے ہیں۔ایک سواری جیب سے پرس نکالے ہوٹل والے کو اپنا بل ادا کر رہی ہے۔سامنے چند سواریاں نمازِ ظہر ادا کر کے نکل رہی ہیں۔

ڈرائیور نے سیٹ سنبھالی۔۔۔ایکسیلیٹر پر پاؤں کا دباؤ ڈالا۔۔۔بار بار ہارن بجایا تا کہ کوئی سواری رہ نہ جائے۔۔۔تحیر نے اس لمحے اسے لپیٹ میں لیا جب اس کی نظر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ڈرائیور کے چہرے پر پڑی۔اسے اپنی بینائی پر شک ہوا اس نے ایک بار باہر کے منظر پر نظر ڈالی، ایک چرواہا اپنی بھیڑیں ہانکنے لیے جا رہا تھا، ایک گدھا گاڑی پر کسی مریض کو لٹا کر شاید ڈسپنسری لے جایا جا رہا تھا، چند بچے گلی ڈنڈا کھیل رہے تھے۔۔۔اس نے اپنے من میں جھانکا، اندر باہر کے منظر یکساں تھے۔یہ ڈرائیور وہ نہیں جو میانوالی سے اس سیٹ پر بیٹھا تھا اور گولے والا سے وہ اس کے سنگ سفر میں تھا۔۔۔اب ڈرائیونگ سیٹ پر ایک سندھی ٹوپی والا درمیانے قد کا شخص تھا۔ وہ پہلے والا ڈرائیور کہاں گیا۔۔۔؟ یہ کہاں سے آیا۔۔۔اسے کس نے اجازت دی ہے کہ یہ ہماری بس چلائے۔۔۔کیا یہ اپنے فن میں ماہر ہے۔۔۔؟ سواریوں میں چہ مگوئیاں جاری تھیں، مکھیوں کی سی بھنبھناہٹ۔۔۔

بس چلی تو اس کے انجن سے عجیب وغریب گڑگڑاہٹ کی آوازیں نمودار ہونے لگیں۔۔۔شاید کوئی فنی خرابی ہے۔۔۔؟

ڈرائیور کیوں بدلا۔۔۔؟

بس کی پچھلی سیٹ پر ایک مخبوط الحواس سواری جس کی شکل اس پاگل سے مشابہت رکھتی ہے جو گولے والا میں پتھر تولے گھوما کرتا تھا۔اس نے کہا۔

''بس میں کوئی فنی خرابی ہے۔۔۔بس روکو۔۔۔بس روکو۔''

لیکن اس کی بات پر کسی نے کیا توجہ دینا تھی۔۔۔مظفر گڑھ سے پہلے بگا شیر کے قریب بس رک گئی۔۔۔''چھوٹے'' نے لکڑی کے ٹول بکس سے اوزار نکالے، ڈرائیور اور کنڈ یکٹر بس کے نیچے لیٹ کر اوزاروں کی مدد سے جس حد ممکن تھا۔اس کی مرمت کرنے کے بعد دوبارہ ہاتھ پونچھ کر اپنی اپنی سیٹ پر بیٹھ گئے۔۔۔بس چلی تو وہ سہم کر اپنے آپ میں سمٹنے لگا۔۔۔اب کے ڈرائیونگ سیٹ پر جو ڈرائیور تھا، اس کے سر کی اطراف میں چند بال تھے، اسے گنجا کہا جا سکتا ہے۔۔۔اس کے چہرے پر اطمینان اور مسکراہٹ تھی۔۔۔اس نے سواریوں سے مخاطب ہو کر کہا۔۔۔

''فکرمندی کی کوئی بات نہیں۔۔۔گاڑی میں فالٹ معمولی ہے، مظفر گڑھ قریب ہے، ہم وہاں سے کسی میکینک کو دکھا لیں گے۔''

ڈرائیور پھر کیوں بدل دیا گیا۔۔۔؟

یار تمہیں کیا۔۔۔بس چل رہی ہے۔اللہ پر بھروسہ رکھو۔

بھروسہ تو مکمل اللہ پر ہے یار لیکن کوئی اناڑی سیٹ پر بیٹھ گیا تو ہم سب بس سمیت جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔

''بگا شیر'' سے ''مظفر گڑھ'' کی مسافت چند کلومیٹر تھی۔۔۔وہاں ایک ورکشاپ کے سامنے بس جا رکی۔میکینک اوزار لے کر بس کے نیچے گھس گیا۔ڈرائیور سامنے ایک ہوٹل پر چائے کی چسکیاں لینے لگا۔سواریوں میں سے کسی نے ایک کھوکھے سے پان سپاریاں اور کسی نے ریڑھی سے فروٹ خرید کر وقت گزارنا شروع کیا۔چھوٹے نے ڈول میں پانی بھر کے ریڈی ایٹر میں ڈالا۔بس جب مظفر گڑھ سے نکلی تو حبس بڑھ گیا۔

''استاد اے۔سی چلاؤ۔۔۔دم گھٹ رہا ہے۔''

''ایئر کنڈیشن کام چھوڑ گیا ہے۔''

چناب پل کراس کرنے تک بس میں حبس اتنا بڑھ گیا کہ سواریاں چلّا اٹھیں۔۔۔

''استاد۔۔۔کچھ کرو نہیں تو ہم مر جائیں گے۔۔۔''

اغلب گمان یہی ہے کہ جب مظفر گڑھ سے بس نکلی تو جو ڈرائیور سامنے کھوکھے پر چائے پی رہا

تھا وہ وہیں رہ گیا۔۔۔ کیوں کہ اس وقت ایک باوردی ڈرائیور نے سیٹ سنبھال رکھی ہے۔۔۔ یہ بھی معلوم نہیں۔۔۔ پہلے ڈرائیوروں کی مانند اس نے کب کیسے یہ سیٹ سنبھالی۔۔۔؟

اس نے ساتھ بیٹھی سواری کو ٹوہکا دیا اور پوچھا۔

''بھائی۔۔۔ یہ باوردی ڈرائیور کب اس سیٹ پر بیٹھا۔''

''پتا نہیں یار۔۔۔ کیا یہ کوئی ہم سے پوچھ کر بیٹھتے ہیں۔'' اس نے سگریٹ کا دھواں چھوڑتے ہوئے بے زاری سے کہا۔

حبس کی وجہ سے سواریاں پسینے میں شرابور ہونے لگی تھیں۔۔ کچھ نے گریبان کے بٹن کھول دیے۔۔۔ ایک بار پھر بھنبھناہٹ سی اور مبہم گفتگو، جس کا کوئی مفہوم سمجھ میں آنے کا سوال ہی نہیں تھا۔۔۔ شاید یہ حبس کا اثر تھا۔۔۔!

''بھائی کون سا شہر ہے۔۔۔؟''

''سکھر۔۔۔ سکھر ہے۔''

''یا خدا۔۔۔ میانوالی ملتان روڈ پر سکھر کہاں سے ٹپک پڑا۔۔۔؟''

''ابھی کوئٹہ کتنا دور ہے۔۔۔'' ایک بوڑھے شخص نے پوچھا۔

''یار۔۔۔ مجھے تو پشاور اُترنا تھا۔''

''کیا۔۔۔ لاہور آنے والا ہے بھائی۔۔۔؟''

''جانے کراچی پہنچنے تک ابھی یہ بس کتنی دیر لے گی۔۔۔؟''

''اماں بھیا۔۔۔ کیا دِلّی آ گئی۔۔۔؟''

''دِلّی۔۔۔؟ کیا دماغ ٹھکانے ہے تیرا۔۔۔؟''

''یار میری ضعیف پھوپھی وہاں میرا انتظار کر رہی ہے۔۔۔''

''کیا واہگہ بارڈر ہم کراس کر آئے۔۔۔ مجھے ''کرنال'' کی خوشبو آ رہی ہے۔۔۔'' ایک انتہائی ضعیف اور خمیدہ کمر شخص نے پوچھا۔

''باباجی۔۔۔ جن شہروں کا آپ نام لے رہے ہیں وہ ہندوستان میں ہیں۔''

''ہمیں کس بس میں سوار کرا دیا گیا ہے۔۔۔؟''

وہ ایک شخص جو ''گولے والا'' سے سوار ہوا تھا اور جسے کنڈیکٹر نے ڈرائیور کی پچھلی نشست پر بیٹھنے کو جگہ دی تھی۔۔۔ اس کا خیال تھا وہ مکمل ہوش میں ہے اور باقی سواریاں حبس کی وجہ سے اول فول بک رہی ہیں۔۔۔ اس نے بہت غور سے باہر کے منظروں کو جانچا۔۔۔

بس فتح پور سیکری سے گزر رہی تھی۔۔۔ ''مغلِ اعظم''۔۔۔ہاتھیوں کے پاؤں کی دھمک۔۔۔ با ادب، ہوشیار باش، نگاہ روبرو۔۔۔!

اسے یقین ہو گیا کہ اس کے حواس ابھی سلامت ہیں۔۔۔وہ ''گولے والا'' سے سوار ہوا تھا، چوک اعظم، اسلام آباد، پنڈی بھٹیاں، روات اور اب بس فتح پور سیکری سے گزر رہی ہے۔

ممبئی، کولکتہ، کانپور، دِلّی، تلہ گنگ، فتح جنگ، کراچی، لاہور، جہلم سے ہوتے ہوئے یہ بس اسلام آباد پہنچے گی۔۔۔رواں دواں بس ایک جھٹکے سے رکی۔ ''چھوٹے'' نے سواری اُتاری اور بس کا دروازہ بند کرنا بھول گیا۔ یہ کوئی ایسی بڑی غلطی نہ تھی لیکن کنڈیکٹر نے پوری توانائی سے ایک زنّاٹے دار تھپڑ ''چھوٹے'' کو جڑ دیا۔ تھپڑ اتنا زوردار تھا کہ سب سواریوں نے اپنے اپنے گال پہ ہاتھ رکھ لیا۔ اس نے بھی اپنا چہرہ ٹٹولا وہاں نشان اور جلن تھی لیکن۔۔۔تھپڑ کی تو خیر تھی۔۔۔سب سواریوں نے دیکھا ''چھوٹے'' کا چہرہ ہر طرح کے تاثر سے عاری ہے۔ چہرے پر درد، کرب اور دکھ کا کوئی پرتو نہیں تھا۔۔۔ایک مکمل سپاٹ چہرہ۔۔۔وہاں کوئی آنسو اُترا، نہ احتجاج۔۔۔صدیوں سے طمانچوں کا عادی چہرہ جیسے روبوٹ۔۔۔

حبس اور طمانچے سے بس میں موجود سواریاں دم گھٹنے سے مر گئی تھیں۔۔۔یا۔۔۔شاید اِن میں زندگی کی کوئی رمق باقی ہو۔۔۔؟

آخری بار ایک سواری کو اخبار کا صفحہ پلٹتے دیکھا گیا تھا۔۔۔

باوردی ڈرائیور آرام سے گاڑی چلا رہا ہے۔۔۔!

آپ کو یاد ہے نا۔۔۔ وہ ایک مسافر جو ''گولے والا'' بس سٹاپ سے سوار ہوا تھا۔۔۔وہ غنودگی کی کیفیت میں ہے۔۔۔!

کیا آپ کو بھی اُونگھ نے آ لیا ہے۔۔۔؟''

کوئی تو بولے۔۔۔سناٹے میں دم گھٹ چلا ہے۔

کیا بس میں کوئی ذِی روح ہے۔۔۔؟

ooo

فرشتہ

— گلزار ملک —

مدت بعد وہ نظر آیا تھا پہچاننا مشکل تھا، جوانی روٹھے اک مدت ہوئی اب پچھلے پہر کی رت بالوں میں اتر چکی تھی۔ نجانے ایسی کونسی آفت ٹوٹ پڑی کہ خود کو بھولے، در بدر پھرتا تھا، پہلے پہل کون جانے کہ اس کے ساتھ ایسا کچھ ہونے والا تھا، اس کی شخصیت کا یہ شائد تاریک ترین پہلو تھا، لڑکپن کی بات ہے جب وہ اس گھر میں نیا نیا وارد ہوا اور پھر کچھ مدت بعد نجانے کس دنیا میں گم ہو گیا، گھر میں اس کی آمد اور روپوشی ہمیشہ معمہ رہی، رسوئی کے کام تو خیر خادمہ جیسے تیسے نپٹا لیتی تھی لیکن کرم دین کے گزر جانے کے بعد اوپر کے چھوٹے موٹے کام کرنے والا کوئی نہ رہا، پھر روشنی کی تیسرے سال اپنے خاوند سے علیحدگی اور اپنی بچی سمیت واپسی پر افسردگی کے ساتھ ساتھ گھر کا کام اور بڑھ گیا، ایسے وقت میں اس کی آمد سے جیسے بھاری بوجھ سر سے اترا، تھا بھی ہاتھ پاؤں کا کھلا، تیز پھرتیلا، بھاگم بھاگ کام نپٹانے والا پاؤں تو جیسے زمین پر نہ ٹکتے، رنگ روپ پہ کس کی نظر، شرمیلے پن میں لڑکیوں سے دو ہاتھ آگے، آنکھیں یوں جھکی ہوئی جیسے زمین سے جڑا کوئی چوپایہ، آسمان سے ناآشنا، ہرفن مولا۔ سودہ سلف خریدنے کا ماہر، ہر شے کی قیمت از بر۔ دوکاندار کو ریٹ لسٹ دیکھے بنا، روزانہ کے تھوک و پرچون نرخ بتا دیتا، دوکاندار تو اسے دوسرے گاہک خراب ہو جانے کے ڈر سے ہی اونے پونے بھاؤ اشیاء تھما جان چھڑاتے، یوں وہ گھر کے اخراجات میں بھی واضح کمی کا باعث بنا، چوبیس گھنٹے کا ملازم تین وقت کی روٹی اور معمولی تنخواہ، جو بعد میں گھر کے بچوں پر ہی خرچ ہو جاتی تھی کیسے بھاری۔

صبح سویرے دودھ دہی سے لے کر گھر کی بیٹیوں نشو اور افشاں کو کالج چھوڑنے تک کا کام سلیقے سے نپٹاتا، بچے تو اسے سارا دن نچاتے کسی کو اس کا ہاتھی بننا پسند تھا تو کسی کو گھوڑا، غرض ہر خواہش پوری ہوتی تو خلاصی پاتا، مہینے کے آغاز میں بچوں کی تو بن آتی، مہینے اور تنخواہ کے خاتمے تک یہ سلسلہ

چلتا،لیکن بندہ تھا بڑا عجیب،کبھی کبھارا سے ایسی چپ لگتی کہ سب گھر والے پریشان ہو اٹھتے ، بڑی آپا ہر ممکن ٹوہ لینے کی کوشش کرتیں لیکن ہر کوشش رائیگاں، ایسے میں ایک گہری خاموشی اور افسردگی اس کے وجود کا احاطہ کیے رکھتی اور آنکھیں نم آلود۔ ہر چہرے کو بے چارگی سے چپ چپتے دیکھتا رہتا جیسے وہ کسی کو تلاش کرر ہا ہو یا پھر کچھ کہنا چاہتا ہو لیکن کہہ نہ پا رہا ہو، اپنے اندر نجانے وہ کون سا بھید چھپائے جی رہا تھا۔

پہلے پہل اس کی اس غیر فطری خاموشی پر سبھی پریشان ہو اٹھے ، بوڑھیوں کا خیال تھا کہ شائد گھر بار سے دوری یا پھر ماں باپ ، بہن بھائیوں کی یاد اس کا کارن ہو، تبھی اس روز پہلی بار انہیں اپنی نادانی کا احساس ہوا کہ وہ لڑکا جو اس گھر میں پچھلے پانچ سال سے تھا دن رات خدمت کرنے والا، اس کی بابت، اس کے گھر بار، دکھ تکلیفوں، دلچسپیوں کی بابت وہ لاعلم تھے۔ باوجود اس شدید خواہش کے، اگلے کئی سالوں تک بھی وہ اس کے بارے میں کچھ نہ جان سکے حتیٰ کہ وہ غائب ہو گیا۔

اس دوران لڑکیوں نے اسے چپکے چپکے روتے کئی بار دیکھا، نجانے کون سا دکھ اس کی روح کو اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا، خاموشی کی اس کیفیت کے دوران اس کے معمولات میں کوئی فرق نہ آتا، سب کام پہلے کی مانند ہی چلتے رہتے، پھر اچانک اس کے اندر کا چور سوئچ آن ہو جاتا اور یوں بچوں کو اپنا من پسند کھلونا مل جاتا، اس کی خاموشی اور اندرونی مخفی دکھ کسی انجانے سے جذبے کے تحت سب کے دل کو چھو گیا تھا اسی لیے خاموش معاہدے کے تحت اب اس کا خیال رکھا جانے لگا، نشو اور افشاں کی شادی ہو گئی، لیکن اسی کی بیماری نے ساتھ نہ چھوڑا بلکہ اب تو وہ باتیں بھی عجیب کرنے لگا تھا، اس کے اندر کا سوئچ بھی نرالہ تھا، نجانے کب ٹھیک کب اوور فلو شروع، بچوں کے ہاتھ اک تماشا لگا اوور فلو میں ہزیان بکنے لگتا لیکن روح کے دکھ کو پھر بھی راستہ نہ ملا۔

بچے پوچھتے ، فرشتے ۔۔۔ جواب ملتا کون فرشتہ، کوئی کہتا تم کون ہو، جواب آتا آئی ایم دا چیف آف آل ملٹری انچارج ، گڈ مجسٹریٹ ، سنٹری فٹنگ دہ الیکشن کمیشن آف پاکستان ، غرض خود کو بڑا افسر گردانتا ، افسر بھی ایسا جو کچہری کے پکے عہدے کا اکلوتا مالک تھا، پھر یوں ہوا کہ بچوں نے شرارت میں خط بھی افسروں جیسا ہی کروا دیا، بچوں کے ہاتھ تو کھیل آ گیا، سارا دن گھریلو کاموں کے ساتھ ساتھ پریڈ چلتی اسی دوران چپکے چپکے رونے کی خبر بڑی بوڑھیوں تک بھی جا پہنچی، ڈاکٹر اور دم درود کا دور چلا ، کچھ افادہ نہ ہوا۔ ڈاکٹروں نے کہا لڑکے کی شادی کر دی جائے ، لیکن پرایا بچہ، کوئی آگے نہ پیچھے ، پھر خود اس کی مرضی جاننا بھی ضروری تھی ۔ جب نارمل ہوا تو زبان پر من بھر تالہ کوئی کچھ اگلوا سکا نہ شادی کے لیے رضامندی ہی سامنے آئی ، اس کی اس حالت کی بابت خوف ذدہ تو سبھی تھے ، لیکن پھر آہستہ آہستہ سبھی عادی ہو گئے ، بندہ بے ضرر تھا، جیسے ہی جون بدلتی لبادے میں واپس لوٹ آتا ، خدا کے بندے کو

کوئی بات یاد نہ رہتی، بچے اسے چیف آف آل ملٹری انچارج، گڈ مجسٹریٹ، سنٹری فٹنگ دہ الیکشن کمیشن آف پاکستان کہہ کر سلوٹ کرتے اور وہ خاموشی سے انہیں دیکھتا رہتا، بار بار تنگ کرنے پر بہت ہوتا تو زچ ہو کر بڑی آپا سے شکائت کرتا۔

وہ بچوں کو بھگا کر نگاہیں پھیرتے ہوئے کہتیں۔

''فرشتے میرے بچے۔۔۔ایسی باتوں کو یاد رکھنے سے فائدہ، بھول جانا ہی اچھا۔''

''بھول جاؤں۔۔۔ بڑی آپا۔ چلو آپ کہتیں ہیں تو بھول ہی جاتا ہوں۔کھو دیتا ہوں خود کو۔۔ جو ڈھونڈنے نکلتا ہے وہ باآسانی خود کو کھو دیتا ہے۔۔۔ پر کیا۔۔ کسے بھول جاؤں اور کسے کھو دوں۔۔آئی ایم سوری، گڈ مجسٹریٹ، سنٹری فٹنگ۔۔۔ اور آنکھیں چرانے لگتا۔۔

پھر ایک روز نجانے کیا ہوا کہ بڑی آپا نے اسے کھڑے پیر نکال باہر کیا، بعد میں پچھتائی بہت، پیار پہ کس کا زور، نکمّے نے کتنے سال گھر کی سیوا کی تھی، سمجھایا بجھایا تو جا سکتا تھا آخری روز جب وہ غائب ہوا تو بڑی بی نے اتنا موقع بھی نہ دیا کہ ہاتھوں کا بوجھ ہی ہلکا کر لیتا، یوں اس کی محبت اور روپوشی دونوں معمہ ہی رہے، جتنے منہ اتنی باتیں، اس کی روپوشی کے سال بھر بعد ہی ایک کاران کے گھر کے سامنے رکی جس سے ایک عورت اور مرد فرشتے کی بابت پوچھنے آئے، کرم جلے کے والدین تھے اچھے بھلے کھاتے پیتے گھرانے کا فرد تھا بعد میں پتا چلا روشنی کے سسرالی رشتے داروں میں سے تھا، اب فرشتے کی بابت وہ کیا کہتے، سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا، نجانے کیوں گھر بار چھوڑ در بدر پھرتا رہا، بیچارے مایوس ہی لوٹے، لیکن بڑی آپا نے تو کوئی روگ ہی جی کو لگا لیا، اور پھر وہ سال بھر بھی نہ جی سکیں۔

مدت بعد آج اسے دیکھ کر روشنی تو حیرت سے دنگ رہ گئی تھی، اسے پہچاننا مشکل تھا اس وقت وہ سامان کی پوٹلی سی لیے ہوئے بیٹھا تھا، دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھے فرشتے کی آنکھیں نیم واہ اور چہرے پر عجیب سی یاس انگیز کیفیت تھی، پھر نجانے کیا ہوا کہ اس نے نیم واہ آنکھوں سے ٹپکنے والے آنسوؤں کو چپکے سے پونچھ ڈالا اور ارد گرد دیکھنے لگا جیسے کسی نے ایسا کرتے ہوئے اسے دیکھ نہ لیا ہو، نجانے کس یاد نے وجود میں دبی ہوئی پراسرار محبت کی چنگاری کو ہوا دی تھی اور وہ سسک پڑا تھا، اس کی محبت بھی ایک بھید تھی، ارد گرد بچے اس کے گہرے دکھ سے بے نیاز اپنے اپنے کھیل میں مشغول تھے اور وہ اپنی ساری زندگی کسی انجانی محبت کی بھٹی میں جھونکے خاموش بیٹھا تڑپ رہا تھا۔

محبت بھی عجیب شے ہے مادے میں لپٹی الوہی طاقت، اندر ہی اندر کسی عضو میں پیدا ہو کر پل بھر میں سارے وجود کو جکڑ لینے والی۔اس پہ کس کا زور تھا کچی عمر کا روگ اب تلک اس کے وجود سے چمٹا خون پی رہا تھا، لیکن وہیں کا وہیں کھڑا، نامعلوم سحر میں مبتلا کسی کے پیار میں گھر بار، دنیا داری، سب

چھوڑ چھاڑ خود کو خاک کرنے نکلا شخص، اس نے اپنی حیاتی رائیگاں گنوادی تھی، اس کی ماں سامنے ہوتی تو شائد بیٹے کے دکھ کو سمجھ پاتی، روشنی کا کلیجہ منہ کو آنے لگا۔

شادی کا ہنگامہ عروج پر تھا، مہمانوں کی چہل پہل میں کسی نے بھی اس پر توجہ نہ دی تھی۔ وہ اتنی مدت بعد کس لیے آیا تھا روشنی سمجھ نہ سکی، وہ آگے بڑھی اور اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی، شناسائی کی چمک کسی کوندے کی مانند اس کی نگاہوں میں لہرائی۔

''فرشتے کدھر چلا گیا تھا تو رے۔''

کچھ دیر وہ بے حس عجیب سی نگاہوں سے روشنی کو دیکھتا رہا، خاموش اور ساکت، اور پھر مدت پہلے چھوڑے درو دیوار اس کی آنکھوں میں لرزنے لگے، وقت کی پرچھائیوں سے جن میں لامتناہی پیار کی جھلک تھی۔ اس کا چہرہ لمحہ بھر کے لئے جگمگایا اور پھر یکلخت تاریک ہو گیا، تبھی وہ اپنی جگہ سے اٹھا تو بغل میں دبی پوٹلی زمیں پر جا پڑی وہ اسے لرزتے ہاتھوں سے اُٹھا کر بولا۔

''مم۔۔۔ میں۔۔۔۔ وہ جملہ مکمل نہ کر سکا لیکن اس کی آنکھوں میں وہی پندرہ بیس سال پرانی افسردگی ڈیرا جمائے بیٹھی تھی۔

''تو ٹھیک تو ہے رے۔۔۔''

'' روشنی بی۔۔۔۔۔۔'' اس نے گردن جھکا دی جیسے بولنے کی سکت نہ ہو۔

''تو نے یہ کیسی حالت بنا رکھی ہے فرشتے۔۔۔تو۔۔۔تو خاک ہی ہوا جاتا ہے رے، کیسا روگ لگایا اپنی روح کو'' وہ افسردگی سے بولی تھی۔ اس کا انجانا دکھ اتنا گہرا اور تند تھا کہ جس کی تاریکی اور گہرائی اسے اپنی جانب کھینچ رہی تھی۔

'' روشنی بی۔۔۔'' وہ اب بھی اتنا ہی بول سکا اور پھر رونے لگا۔

اچانک روشنی کو موقع محل کا خیال آیا، کوئی مہمان دیکھ لیتا تو کیا کہتا، وہ گھبرا کر بولی۔

''فرشتے تو کیوں آیا یہاں پر، آج تجھے نہیں آنا چاہے تھا۔۔۔۔''

''ہاں روشنی بی۔۔ مجھے یہاں نہیں آنا چاہے تھا، اس دنیا میں۔۔ میں نے اکثر یہ سوچا ہے، میں کیوں آیا یہاں پر، لیکن اب جان چکا ہوں، میرا آنا، میرے لیے بہت نیک تھا'' یہ کہتے ہوئے اس کے ہاتھ آہستہ آہستہ کانپ رہے تھے، ایسے لگتا تھا جیسے یہ اذیت بھی اس کے لیے خوش آئند ہو۔

''میرا مطلب۔۔۔ میرا مطلب۔۔۔ روشنی گڑبڑا گئی، وہ آج تک اتنی گھائل نہ ہوئی تھی جتنی کہ اس پل، فرشتے کے جملوں میں عجیب کاٹ تھی۔

تبھی مدتوں پہلے کا بھید کسی فسوں کی مانند اس کی سوچ میں در آیا، ایک انجانا اشتیاق سوال بن

کراس کے لبوں سے ٹپک پڑا۔

'' فرشتے تیری محبت۔۔۔۔۔'' روشنی نے سوال ادھورا ہی چھوڑ دیا۔

فرشتے نے بھی سوال کو سنا ان سنا کر دیا اور گویا ہوا۔

''روشنی بی۔۔۔یاد ہے۔۔۔یہ۔۔۔یہ میرے پاؤں کا ناخن۔اس نے دائیں پاؤں کا ٹوٹا ہوناخن اسے دکھایا، ناخن انگلی سے غائب تھا، یاد ہے یہ کب ٹوٹا، آج سے بیس سال پہلے، بٹی شمع بضد تھی بھینس دیکھنے کے لیے، وہ دودھ دینے والی مشین دیکھنا چاہتی تھی، اس سلسلے میں اسے کئی بار ڈانٹ بھی پڑی، پھر میں آپ دونوں کو کیسے چوری چھپے، چپکے سے بھینس دکھانے دور لے گیا تھا'' اس کی آنکھوں میں انجانے دیپ جل اٹھے، بھینس تو دیکھ لی ہم نے پر اس کو چھونے کی بٹیا کی خواہش پورا کرنے کے لیے مجھے بھینس کے قریب جانا پڑا، تبھی اس نے اپنا بھاری بھرکم پاؤں میرے پیر پر رکھ دیا تھا، جبھی اترا تھا یہ ناخن، آپ نے تو ڈوپٹہ ہی پھاڑ ڈالا تھا اپنا، میرے لیے'' یہ سب کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں بیتے وقت کی یاد سے ہلکی سی چمک پیدا ہوئی اور پھر ماند پڑ گئی جیسے آنکھیں دل کے سارے بھید ساحل تمنا پر سیپیوں کی صورت اگل دینا چاہتی ہوں۔وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا لیکن۔۔۔وہ خاموش ہو گیا، اس کی روح کی بیقراری اس پل نمایاں تھی۔چند لمحوں کے بعد اس نے خود کو سنبھلا اور پھر گویا ہوا۔

''چوری پکڑی گئی تھی اپنی، بڑی آپا نے جو ڈانٹ پلائی، خدا پناہ۔۔۔۔پھر آپ نے سب اپنے اوپر لے لیا تھا، اس کی آنکھوں کے جگنو جل اٹھے تھے۔'' اور روشنی بی۔۔۔یہ پوٹلی۔۔۔جیون بھر کا بوجھ۔۔۔اس نے پرانی سی کپڑے کی پوٹلی جس میں کچھ بندھا ہوا تھا۔روشنی کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اس کی چوکیداری میں اپنی تو ساری حیاتی ہی گئی، چلو اچھا ہی ہوا، جس کی ہے اس تک پہنچی تو۔''

پوٹلی کیا تھی، پندرہ بیس سال پہلے دیہاتی میلے سے خریدی کچھ معمولی اشیاء، جیسے کانسی کے جھمکے، انگوٹھی، کانچ کی چوڑیاں، اور ایک ہاتھ سے کڑھائی کیا رومال جس پر روشنی کا نام کندہ تھا۔۔۔

''یہ۔۔۔یہ۔۔۔سب تو میرا ہی ہے۔'' روشنی چلا اٹھی تھی۔

''میلے میں بھول آئیں تھیں آپ، مجھے ملا تو واپسی پر بڑی آپا نے پکڑ لیا، کچھ سنا نہیں، پوٹلی میرے منہ پر دے ماری اور نکال باہر کیا مجھے، اچھا ہی ہوا، ایسا ہی ہونا چاہیے تھا وہ سسکنے لگا تھا۔

''فرشتے بھول جاؤ سب کچھ۔۔۔'' روشنی کی کنپٹیوں پر یوں جیسے کوئی انجانا سا درد چوٹیں لگانے لگا ہو، لیکن اس نے سنی ان سنی کر دی۔

''آئی ایم سوری، دا چیف آف آل ملٹری انچارج، گڈ مجسٹریٹ، سنٹری فٹنگ دہ الیکشن کمیشن

آف پاکستان۔۔۔'' اور ساتھ ہی نگاہیں چرا کر آنسو چھپانے کی ناکام کوشش کرنے لگا تھا، ایسا کرنے سے اس کا وجود آہستہ آہستہ یوں کانپنے لگا تھا جیسے وہ کسی شدید اور گہرے اندرونی کرب میں مبتلا ہو۔

''فرشتے۔۔۔ میں جانتی ہوں تو میری بات سمجھ رہا ہے، دیکھ ایسی باتوں کو یاد رکھنے کا فائدہ، بھول جانا ہی اچھا۔۔۔ اپنے گھر لوٹ جا رے۔۔۔''

شعلہ سا جلا اور بجھ گیا۔

''بھول جاؤں۔۔۔ سب کچھ اب۔۔۔ ساری زندگی گزار کر، کیا کہتی ہو روشنی بی۔ وہ پہلی بار مسکرایا تھا، اور چل دیا تھا، ایسے جیسے ہوا کے دوش پر لہرا رہا ہو، اس کے قدم یوں اُٹھ رہے تھے جیسے قلیل مدت میں وہ بے پناہ دور نکل جانا چاہتا ہو، دور کہکشاؤں میں۔۔۔ دودھیا رستے پر۔۔۔

ooo

شہزاد

—سمیرا نقوی—

اُسے یقین تھا، ایک نہ ایک دِن اس تعلق کی سانسیں اُکھڑ جائیں گی۔ پھر بھی وہ وفا کے سارے ہنر آزما رہی تھی۔ اُسے یہ بھی پتہ تھا جو مسافت وہ طے کر رہی ہے اُس میں تھک کر گرنا اُس کا مقدر ہے، پھر بھی وہ بھاگ رہی تھی۔

سوال تو یہ تھا کہ وہ ابھی تک تھک کر گری کیوں نہیں۔صدیوں کی مسافت تھی۔۔۔اگر وہ شمار کرتی۔

اور۔۔۔تھا کیا اِس تعلق میں جسے وہ نبھانے پہ تلی ہوئی تھی۔

نہ قربت کی اوس میں بھیگا کوئی اَدھ کِھلا گلاب!

نہ حدتِ لمس سے پھوٹتا کوئی بے تاب جذبہ!

نہ خیالِ جاں میں ہم نشیں کوئی اچھوتا مکالمہ!

بے تاثر دبے پاؤں رینگتے۔۔۔کچھ قربت کے لمحات۔۔۔جنھیں وہ اثاثۂ حیات سمجھ بیٹھی تھی۔

بے زاری کی گرد سے اَٹے چند مکالمے۔۔۔جس سے اُس کا اپنا وجود گرد آلود تھا۔ وہ اِسی اُڑتی دھول میں اپنے گرد آلود سراپے کے ساتھ اپنے وجود کا اثبات چاہتی تھی۔

کیا یہ ممکن تھا۔۔۔؟

کتنا احتجاج تھا اُس کے لہجے میں جب دو مائیں اپنے پیار کو اعتبار دے رہی تھیں۔ یہ سوچے بنا کہ وہ اُسے بے اعتبار کر رہی ہیں۔ وہ تو گھونگھٹ اُٹھائے جانے کی بھی منتظر نہ تھی کہ وہ جانتی تھی کہ اگلا منظر کیا ہوگا۔۔۔؟

کسی کا چہرہ دُھواں دُھواں ہو جائے گا۔

کانچ جیسی آنکھوں میں سجے حسین ہم سفر کے خواب ٹوٹ کے چکنا چور ہو جائیں گے۔۔۔

تو کیا وہ آنکھیں بند کرے گی۔۔۔؟

کھولے گی تو کیا دیکھے گی؟

مہکتے کمرے میں پھیلتی گھٹن۔۔۔!

گلاب کے پھولوں میں سفر کرتی اُداسی۔۔۔!

چھن! چھن! بجتے زیوروں میں ٹھہری قبرستان کی منجمد خاموشی۔

جگ مگ کرتے منظروں میں اُترتی تاریکی۔۔۔!

وہ آنکھیں بند کرے یا بینائی مستعار دے دے۔اُسے دیکھنا تو یہی تھا۔

وہ رُوپ کی دھوپ مانگنے نکلتی بھی تو کہاں جاتی؟

جمال کم نما کے لیے کونسی تاویل گھڑتی۔۔۔؟

خاموشیاں راہ ڈھونڈ رہی تھیں۔۔۔جذبے کسی ساکن جھیل کی تہہ میں رُکے ہوئے۔۔۔کسی پتھر کے گرنے کے منتظر تھے۔

کہاں سے آئے گا پتھر۔۔۔؟

اُس نے خوشبو کو بے زبان ہوتے دیکھا۔۔۔

اُسے اپنا مقدر سمجھا۔

وہ کرتی بھی تو کیا کرتی۔

سادہ لوح معصوم، ہانڈی چولہے سے جُڑی عورت جس کا سارا کمال چمکتے گھر میں تھا۔

خوش ذائقہ کھانے میں تھا۔

یا پھر ماہر ہاتھوں سے گرم بستر بچھا دینے میں تھا۔

یہ سب کچھ کرنے کے باوجود منظر ویسا ہی تھا۔

کھانے کی میز پہ سجا کھانا۔۔۔آمنے سامنے بیٹھے دو افراد۔۔۔جو اپنے اپنے دائرے میں بولتے نہ تھکتے تھے۔مگر جب ایک دوسرے کے سامنے آ بیٹھتے تو موضوعِ گفتگو نہ ملتا۔۔۔برتنوں کے اُٹھائے اور رکھے جانے کی آواز۔۔۔جگ سے گلاس میں گرتا پانی۔۔۔پلیٹ سے ٹکراتے چمچ اگر بھولے سے نگاہیں ٹکرا جائیں تو تھکی تھکی مسکراہٹوں کا تبادلہ۔۔۔اور بس!

پھر رات گئے تک ٹی وی گفتگو کرتا۔۔۔

وہ ایک نظر موبائل پر رکھتا جہاں باتوں اور رِشتوں کا جہان آباد تھا۔ وہ گفتگو کرتے بھی تو

مکالمہ بہت جلد دم توڑ دیتا۔ چھوٹے، چھوٹے جملے۔۔۔ جو صرف ضرورتوں کو جوڑ دیتے تھے۔

''بجلی کا بل کل جمع کروا دیجیے گا۔ آخری تاریخ ہے۔''

''اچھا!'' نگاہوں کا ارتکاز اِس مکالمہ میں ایک پل کے لیے نہ ٹوٹتا۔

''خالہ جی نے آنا ہے۔ گوشت، پھل، سب ختم ہے۔''

''کل لے آؤں گا۔۔۔''

وہ اُس کی آنکھوں اور اُنگلیوں کے ربط کو توڑنے میں مسلسل ناکام تھی۔

''یاد آیا۔۔۔ آپ کی کچھ ڈاک آئی تھی۔''

اُنگلیاں ساکت ہو گئیں۔ موبائل سکرین تاریک، ٹی۔وی پر لہراتے رنگین آنچل سے نگاہیں ہٹ گئیں۔

''اب یاد آیا ہے۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی اُس کے لہجے اور چہرے سے خفگی کا تاثر اُبھرا۔

وہ شرمندگی کا احساس مٹانے کو فوراً اُٹھ بیٹھی اور احتیاط سے سنبھالی ڈاک لا کر اُس کے ہاتھ میں تھما دی۔

''چائے پئیں گے؟''

دُور دیس سے آئی، کاغذوں سے لپٹی کسی کی معصوم چاہت۔۔۔ اور سر پر کھڑی چائے کا پوچھتی بیوی۔۔۔

''لے آؤ!''

اُسے منظر سے ہٹا کر وہ کاغذوں سے نکل کر کمرے میں پھیلتی خوشبو کا اسیر ہونے لگا۔ وہ کاغذوں میں بسی انھی محبتوں میں زندہ تھا۔ زندگی سے دُور ہو کر وہ زندگی کی پناہ میں جانا چاہتا تھا۔۔۔ کیسا سادہ تھا وہ۔

چائے کی پیالی میز پر دھری تھی۔۔۔ جس سے اُٹھتی بھاپ اُن دونوں کے درمیان حائل ایک مہین سا پردہ۔۔۔ وہ جتنا زندگی کے اِس چلن کو بدلنے کی کوشش کرتی وہ اِتنا ہی اپنے دائرے میں سمٹتا چلا گیا۔

ایک لگی بندھی روٹین تھی۔ ناشتہ، آفس، رات کا کھانا، واک۔۔۔ پھر موبائل، ٹی۔وی، کاغذ، قلم اور کتاب وہ انھی کا آسرا لے کر قدم بہ قدم بڑھتا جا رہا تھا اور اُن کے درمیان رابطے کا مرکز ٹوٹتا جا رہا تھا۔

وہ ڈھلتی شام میں جب واک کے لیے نکلتا تو اُس کا جی چاہتا وہ اُسے روک لے اور کہے!

''اس پہر تنہائی اُسے کاٹتی ہے۔گھر آ کر پھر اُس کا گھر سے نکلنا اُسے اُداس کرتا ہے۔''
پر یہ سارے لفظ اندر ہی کہیں بنتے بگڑتے رہتے۔
پھر ایک روز اچانک ٹی وی سکرین کا منظر نامہ بدل گیا۔خبریں آگ اُگل رہی تھیں۔۔۔
افراد کی چیخ و پکار۔۔۔بہتا لہو۔۔۔آگ پھیلتی جا رہی تھی۔افواہیں، آندھیاں بن کر پورے نظام کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھیں۔خون سڑکوں پر بکھر کر راہ چلتوں کا راستہ روک رہا تھا۔گھڑی کی سوئیاں آٹھ کے ہندسے کو پار کر گئیں۔آج وہ گھر سے باہر نہیں گیا۔
معمول میں کچھ تو فرق آتا۔
سرشاری کی لہر اُس کے وجود میں دوڑ گئی۔بے اختیار ہی یہ جملہ اُس کے ہونٹوں سے پھسل گیا۔جو اُس کی خوشی کا اظہار کر سکا نہ تشویش کا۔
''آج آپ واک پہ نہیں جائیں گے۔''
یہ جملہ بدگمانی کا سفیر بن گیا۔
''تمہیں ہر طرف پھیلا خون نظر نہیں آ رہا۔تم چاہتی ہو کہ میں بھی دوسروں کے کاندھوں پہ سوار ہو کے گھر لوٹوں۔''
اِس جملے پہ اُس کی آنکھیں سرخ اور پھر اِس سرخی میں پانی پھیل گیا۔
اور وہ جھک کر موبائل سکرین سے وہ پیغام کھوجنے لگا جس میں اُس سے کہا گیا تھا۔
''آج واک پر دھیان سے جائیے گا۔۔۔''
وہ اندر ہی اندر اعتراف کرنے لگی اُسے لفظ برتنے کا شعور نہیں ہے۔
اور وہاں۔۔۔!
تخلیق کے چشمے تھے۔
رنگ برنگ لفظ تھے۔لفظوں سے جنم لیتے شوخ کردار تھے۔حسن و جمال کے لازوال پیکر تھے۔
اور وہ۔۔۔!
اِن لفظوں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر خود کو نکالتی کہ شاید کسی حاشیہ میں ہی بسی وہ مِل جائے۔۔۔
پر کہاں۔۔۔؟
وہ تو حاشیہ آراؤں میں بھی نہ تھی۔مرکزی خیال تو بڑی دُور کی بات ہے۔
اُس نے اُس حسن پرست تخلیق کار کو ہر فکر سے آزاد کر دیا۔۔۔کبھی کبھی اُس کی آنکھوں میں اپنے لیے ممنونیت کی چمک دیکھتی تو بس نہال ہو جاتی۔

گھر کے کسی کونے میں پڑا کوئی مڑا تڑا کاغذ بھی وہ اِس خوف سے باہر نہ پھینکتی کہ شاید۔۔۔
کوئی کردار۔۔۔

کوئی مکالمہ۔۔۔!

کسی گم شدہ کہانی کا سراغ۔۔۔!

وہ اُسے سیدھا کر کے ٹیبل پر پیپر ویٹ کے نیچے رکھ دیتی۔

وہ اِس احساس سے پگھلنے لگتا کہ کوئی اُس کا اِتنا دھیان رکھتا ہے۔ پر وہ کیا کرتا۔۔۔؟

سیاہ بادلوں میں چھپا اُس کا وجود۔۔۔ اُس کی سوچ کے سارے ستارے ماند پڑ جاتے۔ جذبے سائبیریا کی برف میں دب کے رہ جاتے۔۔۔ دیواریں بلند ہوتی جاتیں۔۔۔ وہ اُس پار سسکنے لگتا۔۔۔ وہ اِس پار نئے سرے کسی رُوپ نگر کا پتہ ڈھونڈنے لگتی۔۔۔!

کوئی دانش مند ہوتا تو اُسے سمجھاتا کہ روپ ہوتا بھی تو تیرا یہی حال ہوتا۔۔۔

وہ تخلیق کار تھا۔۔۔

اور وہ عام سی عورت۔۔۔

تخلیق کار کے لیے تو الف لیلیٰ کی شہرزاد ہونی چاہیے جو ایک رات میں ہزار داستان سنائے۔ جو ہر رات نیا رُوپ دھار لے۔۔۔ سارے منظر، سارے کردار بدل ڈالے۔

جس کے سامنے تخلیق کار کے سارے لفظ گونگے ہو جائیں۔

جس کے سات رنگ ہوں۔ ڈھونڈے تو ایک رنگ نہ ملے۔ رنگوں کی شناخت کا مرحلہ تمام عمر طے نہ ہو۔ کھوج کا سفر کبھی منزل کو نہ پائے۔ تخلیق کار کے لیے وہ کسی غیر حل شدہ سوال کی طرح رہے۔

مگر اُس کا تو ایک ہی رنگ تھا۔

مدھم، پھیکا۔۔۔ بجھا، بجھا۔۔۔

○○○

غزلیں

—بیدل حیدری—

یہ جو اِک گردش زمانہ ہے — اس کا دورانیہ گھٹانا ہے
روشنی کا نزول چاہتا ہوں — درِ الہام کھٹکھٹانا ہے
بولیاں لگتی دیکھنی ہیں کبھی — کبھی نیلام گھر میں جانا ہے
یہ جزا و سزا کی بات نہیں — مجھے عہدِ ازل نبھانا ہے
ایک پتھر ہے غار کے منہ پر — اور وہ پتھر مجھے ہٹانا ہے
سامنے دار ہو کہ دریا ہو — عشق کی جیت والہانہ ہے
بند مُٹّھی نے کیا دیا ہے مجھے — اس بھرم کو بھی اب گنوانا ہے

بیدلؔ اتنے بھی پاؤں مت پھیلا
کل تجھے بھی لحد میں جانا ہے

OOO

طرح طرح کی جگہوں پر اُتر کے دیکھتے ہیں — طیور دِن میں کئی بار مَر کے دیکھتے ہیں
گزشتنی کو قلم بند کر کے دیکھتے ہیں — اس ابتلا سے بھی اِک دِن گزر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے ترکِ وفا کا ہے لطف ہی کچھ اور — یہ تلخ گھونٹ کبھی ہم بھی بھر کے دیکھتے ہیں
وہ جب کناروں پر آ کر دھمال ڈالتا ہے — سمندروں سے جزیرے اُبھر کے دیکھتے ہیں
نہیں یہ شہر جو اُس کا، نہ ہو، کسی کا تو ہے — اب آ گئے ہیں تو کچھ دِن ٹھہر کے دیکھتے ہیں
اس انتظار کی شب کا کوئی بھروسہ ہے — دِیے کی لو کو پس انداز کر کے دیکھتے ہیں

جو کان رکھے ہیں دروازے پر تو پھر بیدلؔ
اب آنکھ بھی کسی روزن میں دھر کے دیکھتے ہیں

OOO

حویلی دل کی خالی ہے۔۔۔نہیں تو
کہ خالی ہونے والی ہے۔۔۔نہیں تو

یہ کیا دھونی رما لی ہے۔۔۔نہیں تو
یہ کیا حالت بنا لی ہے۔۔۔نہیں تو

تو کیا اِس دل کی بستی کے علاوہ
کوئی بستی مثالی ہے۔۔۔ نہیں تو

میں کیوں اتنا اُچھلتا پھر رہا ہوں
کوئی پگڑی اُچھالی ہے۔۔۔نہیں تو

میں اپنی نوحہ خوانی خود کروں گا
صفِ ماتم بچھا لی ہے۔۔۔نہیں تو

محبت اُٹھ نہ جائے ، خیر مانگو!
محبت اُٹھنے والی ہے۔۔۔نہیں تو

تجھے یک دم یہ کیا ہوتا ہے بیدلؔ
طبیعت لا اُبالی ہے۔۔۔ نہیں تو

OOO

اس نے کل گاؤں سے جب رختِ سفر باندھا تھا
بچہ آغوش میں تھا ، پشت پہ گھر باندھا تھا

اُنگلیوں پر بھی نچایا ہے سمندر ہم نے
ہم نے اِک دَور میں چپو سے بھنور باندھا تھا

اب جو دم گھٹتا ہے زنداں میں تو روتے کیوں ہو
تمہی لوگوں نے تو دیوار کو دَر باندھا تھا

یہ جو لوگوں کو اب آواز سے پہچانتا ہے
اس کی ماں نے اسے تعویذِ نظر باندھا تھا

اس کی یادوں نے بنا دی تھی مسافت دُشوار
اس نے آندھی کی طرح میرا سفر باندھا تھا

جنگ کو جیت کے جس وقت میں لوٹا بیدلؔ
اس نے سہرا ہی کسی اور کے سر باندھا تھا

OOO

غزلیں

—جعفر طاہر—

دَم زناں مست ہمہ دم تنا نا ھُو یا ھُو کوئی رُت ہو کوئی موسم تنا نا ھُو یا ھُو
یہ سجل رُوپ ، کنول نین ، روپہلی آواز مسکراہٹ کا یہ عالم تنا نا ھُو یا ھُو
کانپتی پلکوں پہ تارے تنا نارے رے رے یہ شبِ گیسوے پُرخم تنا نا ھُو یا ھُو
روے پُر نور پہ صد صبحِ تجلی قرباں یہ حَسین کرنوں کی جَھم جَھم تنا نا ھُو یا ھُو
کون آیا ہے یہ گل گشتِ سحر گاہی کو لبِ ہر گُل پہ گجر دم تنا نا ھُو یا ھُو
آوَ جے تال کی لہروں پہ ذرا رقص کریں آج وہ زلف ہے برہم تنا نا ھُو یا ھُو
گدگداتے ہیں جواں رند حسیں ساقی کو ہائے یہ نغمۂ پیہم تنا نا ھُو یا ھُو
کوئی عالم ہو بہرحال گزر جاتا ہے ہیچ ہیں شادی و ماتم تنا نا ھُو یا ھُو
دوستو اپنی نظر کا ہے یہ دھوکا ورنہ نہ کوئی گُل ہے نہ شبنم تنا نا ھُو یا ھُو
یوں تو دُنیا میں سب اپنے ہیں مگر کون اپنا نہ کوئی یار نہ محرم تنا نا ھُو یا ھُو
اب یہ کہتے ہو کہ اپنا بھی خدا ہے کوئی تم سے کہتے ہی رہے ہم تنا نا ھُو یا ھُو
سوے مقتل ہیں رواں مست غزالوں کے ہجوم گنگناتے ہوئے باہم تنا نا ھُو یا ھُو

کعبہ و دیر کی سرحد پہ کھڑا ہوں طاہر
جے سری رام کی بَم بَم تنا نا ھُو یا ھُو

OOO

چھیڑ کر تذکرہَ دَورِ جوانی رویا
رات یاروں کو سُنا کر میں کہانی رویا

ذِکر تھا کُوچہ و بازار کے ہنگاموں کا
جانے کیا سوچ کے وہ یوسفِ ثانی رویا

غیرتِ عشق نے کیا کیا نہ بہائے آنسو
سُن کے باتیں تری، غیروں کی زبانی، رویا

جب بھی دیکھی ہے کسی چہرے پہ اک تازہ بہار
دیکھ کر میں تری تصویر پرانی ، رویا

کس نے دی شوخیِ رفتار کی میری طرح داد
کون یوں دیکھ کے دریا کی روانی رویا

چشمِ اربابِ وفا ہے جو لہو روتی ہے
غیر پھر غیر ہے ، رویا بھی تو پانی رویا

تیری مہکی ہوئی سانسوں کی لویں یاد آئیں
آج تو دیکھ کے میں صبح سُہانی رویا

اے وطن ، جب بھی سرِدشت کوئی پُھول کِھلا
دیکھ کر تیرے شہیدوں کی نشانی ، رویا

ooo

مٹ جائے مِرا نام و نشاں ہو نہیں سکتا
یہ ظلم سرِ لوحِ جہاں ہو نہیں سکتا

آواز پہ آواز دیے جاتی ہے دُنیا
رُک جائے ، مری عمرِ رواں ہو نہیں سکتا

مے پی کے جھلک نور کی آ جاتی ہے منہ پر
ایمان ہو دِل میں تو زیاں ہو نہیں سکتا

اے چشمِ فسوں ساز کبھی کر تو اشارہ
دیکھوں تو میں کس طرح جواں ہو نہیں سکتا

دوزخ میں بھی آنے لگیں جنت کی ہوائیں
یا رب ، تری رحمت کا بیاں ہو نہیں سکتا

ہر شخص نظر آتا ہے بیگانہ سا یا رب
یہ کعبہ ہے یہ کُوئے بتاں ہو نہیں سکتا

دانائی کا احساس بھی اک جرم ہے لیکن
اس جُرم کا ہم پر تو گُماں ہو نہیں سکتا

یا رب نظر آتے نہیں احباب کے چہرے
آباد یہ ویرانۂ جاں ہو نہیں سکتا

تُربت پہ مِری بارشِ انوار بھی ہو گی
تاریک تو مومن کا مکاں ہو نہیں سکتا

بیعت نہ جسے ساقیِ کوثر سے ہو طاہرؔ
وہ کوئی بھی ہو پیرِ مغاں ہو نہیں سکتا

ooo

غزلیں

—صابر ظفر—

کچھ لفظ لغاتِ دِل و جاں میں نہیں ملتے
وہ ایسے مکیں ہیں جو مکاں میں نہیں ملتے

کیا ڈوبتے سورج کی شعاعوں کو سمیٹیں
یہ سود کے ساماں تو زیاں میں نہیں ملتے

کرنا پڑے کیوں ہم کو رجوع اگلے جہاں سے
کیوں لوگ کسی ایک جہاں میں نہیں ملتے

تعبیر جنہیں کرتے ہیں نازک بدنوں سے
وہ لوگ کبھی خوابِ گراں میں نہیں ملتے

مِل کر ہمیں تم بھی کبھی دیکھو کہ ظفؔر ہم
ملتے ہیں حقیقت میں، گماں میں نہیں ملتے

OOO

پانی پہ کوئی نقشِ کفِ پا نہیں ملتا
لے جائے جو اُس پار وہ رستا نہیں ملتا

ڈھونڈ آیا ہوں اُس کو، سبھی افلاک ہیں خالی
ملتا ہے زمیں پر تو وہ زندہ نہیں ملتا

مَیں خود ہی سنبھل جاتا ہوں جب لگتی ہے ٹھوکر
جو دِل کو سنبھالے وہ مسیحا نہیں ملتا

مَیں کس کا طرف دار ہوں مَیں کس کا عزادار
پانی نہیں ملتا مجھے توشہ نہیں ملتا

ہر کوئی مقام اپنا بنانے میں لگا ہے
تو ہے کہ ظفؔر، تیرا ٹھکانا نہیں ملتا

OOO

بیٹھا ہوں مَیں عبث، اِدھر آ کر سویر سے
ہو گی نجانے دید تری کتنی دیر سے

تو نے بھی خود ہی توڑ دیا تارِ زندگی
مَیں بھی نکلنے والا ہوں سانسوں کے پھیر سے

تو بھی سمٹ کے سو گیا یوں اپنے شہر میں
گرداب دُور جاتا نہیں جیسے گھیر سے

بے جان کر دیا ہے وہ اِک لفظ موت نے — چاہے زَبر سے لکھیں اُسے چاہے زیر سے

لمحوں کی خاک چھاننا بے سود ہے ظفؔر
جو چاہیے اُٹھایئے مٹی کے ڈھیر سے

ooo

ہم آدمی تھے ہمیں خاک دُھول ہونا تھا — رسول ہو چکے جن کو رسول ہونا تھا
بچھڑ کے تجھ سے جو لکھنا تھا یاد میں تیری — کلام کا وہی حصہ قبول ہونا تھا
وہ سن شباب کا تھا اور رُت وصال کی تھی — سمٹ کے تجھ کو حنا، کھل کے پھول ہونا تھا
ہمارا راستا روکے ، مجال کس کی تھی — خود اپنی راہوں میں ہم کو ببول ہونا تھا

بشارتیں تجھے کیا دیتے ہم خوشی کی ظفؔر
ہمیشہ ہم پہ تو غم کا نزول ہونا تھا

ooo

آیئے ، سطحِ آب پر ، شکل کوئی بنایئے — اور نثار کیجیے دِل ، اور فریب کھایئے
ہاتھ میں کوئی ہاتھ تھا ، کوئی ہمارے ساتھ تھا — آئے گا اب کسے یقیں ، یاد کسے دِلایئے
کوئی بگولہ تھا یہ دِل ، راستا بھولا تھا یہ دِل — ہم کو بھی یاد کچھ نہیں ، آپ بھی بھول جایئے
رنگ بھی زرد ہو چلا ، جسم بھی سرد ہو چلا — جنبشِ دِل کے واسطے ، درد کہیں سے لایئے

عہدِ عبث کی یاد کیا ، پچھلے برس کی یاد کیا
ساعتِ نو ہے منتظر ، آگے قدم بڑھایئے

ooo

کسی کے دِل میں اُترنے کا راستا کوئی ہو — قریب ہے وہ زمانہ کہ آشنا کوئی ہو
پڑا ہوا ہوں کسی سنگِ بے طلب کی طرح — خدا کرے کہ درِ انتظار وَا کوئی ہو
مَیں اُس کے ساتھ چلوں، چاہے مَیں بکھر جاؤں — تری تلاش میں نکلی اگر صدا کوئی ہو
مری نوا ہی بہت ہے اگر سنی جائے — نہیں ہے کوئی ضروری کہ ہم نوا کوئی ہو

مَیں زندگی سے بہت دُور جا رہا ہوں ظفؔر
شکست دے جو اجل کو وہ دلربا کوئی ہو

ooo

غزلیں

—کاشف نعمانی—

اب میں اُس کا کوئی احسان اُٹھانے سے رہا
خود وہ آنے سے رہی اور میں بلانے سے رہا

بے نیازی اسے جچتی ہے ، مگر کیا کیجیے!
میں اب اس عمر میں یہ ناز اُٹھانے سے رہا

کوئی پوچھے ہے، تو کہتا ہوں کہ ''ہاں ٹھیک ہوں میں''
راہ چلتوں کو تو ہر بات بتانے سے رہا

ناک نقشہ تو اُسی کا ہے ، مگر حسن اس کا
اے مصور ! تری تصویر میں آنے سے رہا

جن میں اک تو بھی تھی ، اُن عارضی خوشیوں کے لیے
میں نبردآزما ، اک عمر ، زمانے سے رہا

ہاں ! پسینے میں لہو اور ملا سکتا ہوں
آسمانوں سے ستارے تو ، میں لانے سے رہا

OOO

وہ یار طرح دار کسی اور کا ہوا
لیکن مجھے ملال ، کسی اور کا ہوا

کیسی عجیب شام تھی ! جب طاقِ چشم پر
روشن چراغِ خواب ، کسی اور کا ہوا

تقسیم اس طرح ہوئی ، املاکِ مے کدہ
مینا کسی کی ، جام ، کسی اور کا ہوا

روشن مرے اُفق پہ ، ہوا تھا وہ پہلی بار
لیکن دمِ زوال ، کسی اور کا ہوا

تھا ، جو مجھے اسیر بنانے کی فکر میں
وہ آپ زیر دام کسی اور کا ہوا

اتنا بدل گیا تھا وہ دو چار روز میں
اُس پر مجھے گمان ، کسی اور کا ہوا

OOO

غزل

-جمشید مسرور-

طلب جو ہو بھی تو ہم ہونٹ بند رکھتے ہیں
کہ ہم اَنا کا علم سر بلند رکھتے ہیں

وہ چیز لیں گے جسے دِل قبول کر لے گا
کہ بے کسی میں بھی اپنی پسند رکھتے ہیں

کسی کے لقمۂ تر پر نگاہ کیوں رکھیں
ہم اپنے ہاتھ میں اپنی کمند رکھتے ہیں

ہماری موت کا فرمان ہے تو پھر کیا ہے
نہ چشمِ نم نہ دِل درد مند رکھتے ہیں

حذر کرو کہ رفیقانِ گُل بکف جمشیدؔ
دِلوں میں لاکھ طرح کے گُزند رکھتے ہیں

○○○

غزل

—رامش منہاس—

بچھڑ کر بھی اگر اُس کو خوشی ہے
تو اس کی آنکھ میں پھر کیوں نمی ہے

چلے آؤ یہ منظر دیکھنے کو
بغیر ابر بارش ہو رہی ہے

میں کیا ڈوبا تھا گہرے پانیوں میں
میرے ہونٹوں پہ اب تک تشنگی ہے

پرندے ہجرتیں کرنے لگے ہیں
خدا جانے ہوا کیسی چلی ہے

دیارِ دِل کی اس تیرہ شبی میں
تمہاری یاد سے ہی روشنی ہے

بہاریں لے گیا رامشؔ وہ جب سے
مِرے گھر میں خزاں ٹھہری ہوئی ہے

غزلیں

—عارف شفیق—

کٹ گئی ہے جو زباں ہونٹ ہلاتے رہنا
اپنے ہونے کا تو احساس دِلاتے رہنا

یہ نہ ہو شہر میں تنہائی کے مجرم ٹھہرو
سرد مہری ہے تو کیا ہاتھ ملاتے رہنا

جاگ اُٹھے گی یہی گونگی ساعت اک دِن
تازہ لہجے میں غزل اپنی سناتے رہنا

رُوح کے زخم چھپا لینا ہنسی میں لیکن
دِل کے صحراؤں میں تم پھول کھلاتے رہنا

میرے لہجے میں مرے عہد کی سچائی ہے
میری آواز سے آواز ملاتے رہنا

میں ہمیشہ کی طرح سچ ہی کہوں گا عارف
تم ہمیشہ کی طرح زہر پلاتے رہنا

ooo

یوں بیٹھا ہوں اپنی ذات کے اندر چپ
جیسے بچہ ہو جاتا ہے ڈر کر چپ

گولی کی آواز میں پھر اک چیخ دبی
خوشبو جگنو تتلی پھول کبوتر چپ

سڑکوں پر پھر اُبھری بھاری بوٹ کی چاپ
شام ہوئی تو پھیل رہی ہے گھر گھر چپ

کیا گزری ہے شہر کراچی پر لوگو
کیوں ہے میرے شہر کا ہر اِک منظر چپ

میں نہ پیمبر تھا اوتار نہ سادھو تھا
کب تک پیٹ پہ باندھ کے رہتا پتھر چپ

شاید اس کے دُکھ بھی میرے جیسے ہیں
ہو جاتا ہے شعر مرے وہ پڑھ کر چپ

قحط نہ سچائی کا پڑ جائے عارف
رہنے لگا ہے تو بھی جو اب اکثر چپ

ooo

شبِ وصال کے قصے سنا رہا ہے دِیا
ہے رات ڈھلنے کو اب ٹمٹما رہا ہے دِیا

اندھیری رات میں بھٹکے مسافروں کے لیے
ہوا کے وار سے خود کو بچا رہا ہے دِیا

ملن کی رات ہے خوشبو ہے گرم سانسیں ہیں
قریب طاق پہ اِک مسکرا رہا ہے دِیا
اندھیرے کاٹ کے سورج بھی کل تراشے گا
ابھی جو چاک سے بچہ بنا رہا ہے دِیا
اندھیرے کالے کنویں سے جسے رہائی دی
وہ شخص میرے ہی گھر کا بجھا رہا ہے دِیا
یہ روشنی سی جو کھیتوں میں لہلہاتی ہے
زمیں کی تہہ میں بھی کیا جگمگا رہا ہے دِیا
ہوا کی زد پہ بھی رہ کر یہ تیرگی کا بوجھ
عجیب شان سے سر پر اُٹھا رہا ہے دِیا
مجھے یہ لگتا ہے عارف شفیق میری طرح
کسی کی یاد میں خود کو جلا رہا ہے دِیا

ooo

سرد رُتوں میں آگ لگائے پھرتا ہوں
چہرے پر میں دھوپ سجائے پھرتا ہوں
گھر والوں نے مار دیا تھا بچپن میں
اب تک اپنی لاش اُٹھائے پھرتا ہوں
ایسے بھی کچھ زخم دیئے ہیں دُنیا نے
خود سے بھی میں جن کو چھپائے پھرتا ہوں
میرے شعر ہیں میری زیست کا سرمایہ
ان کو ہی سینے سے لگائے پھرتا ہوں
میں بھی جنگی قیدی ہوں اس دھرتی پر
بے بس دونوں ہاتھ اُٹھائے پھرتا ہوں
دھوپ نگر میں ماضی کے کچھ خواب لیے
تیری یاد کے سائے سائے پھرتا ہوں
کیا کوئی سچا شعر لکھا ہے پھر میں نے
شہر سخن میں کیوں اترائے پھرتا ہوں
آگ اور خون کی بستی میں تنہا عارفؔ
چاہت کا پرچم لہرائے پھرتا ہوں

ooo

جہاں میں اپنا ہونا بھی طلسماتی لگا مجھ کو
ازل سے جو ابد تک ہے وہ لمحاتی لگا مجھ کو
جسے دیکھا وہ اپنی ذات کے زنداں کا قیدی تھا
یہ سارا شہر ہی اپنا حوالاتی لگا مجھ کو
مرا احساس زندہ تھا ابھی اس دورِ بے حس میں
کسی کا دُکھ سنا تو کس قدر ذاتی لگا مجھ کو
پرندے پھول پودے رنگ خوشبو اور ہوا اُجلی
سحر کے وقت کا منظر مناجاتی لگا مجھ کو
یہ ہمدردی غریبوں سے امیروں سے تری نفرت
یہ تیری سوچ کا پہلو بھی طبقاتی لگا مجھ کو
سبھی محرومیاں دُکھ درد خوشیاں ایک جیسی تھیں
یہاں اپنا ہی جیسا ہر ملاقاتی لگا مجھ کو
عجب خوش فہمیوں میں خط اسے لکھا تھا اِک میں نے
نہیں میں بھی جواب آیا تو اثباتی لگا مجھ کو
تھی اس کی شاعری اک دُکھ بھرے احساس کی دُنیا
جو عارف دیکھنے میں غیر جذباتی لگا مجھ کو

ooo

غزلیں

—سجاد حیدر—

خردمندی ، کبھی آشفتگی تقسیم کرتے ہیں
ہمارے ہاتھ جو آئے وہی تقسیم کرتے ہیں

ہمیں دیوانگی نے دیکھیے کیا مشعلہ سونپا
کہ غم تو پاس رکھتے ہیں، خوشی تقسیم کرتے ہیں

جو شب بھر گھومتے ہیں شہر کی ویران سڑکوں پر
وہ اپنا اضطراب و بے کلی تقسیم کرتے ہیں

نہ پوچھو شامِ تنہا اور جدائی کے زمانوں میں
اکیلے لوگ کیسے وقت کی تقسیم کرتے ہیں

کبھی دریائے شب سے جگنوؤں کی بھیک ملتی تھی
اور اب یہ تیرگی ہی تیرگی تقسیم کرتے ہیں

یہ کس کس کو زمانے نے سخاوت کی سند دے دی
جو اپنے مال و زر سے مفلسی تقسیم کرتے ہیں

یہ کیسا ظلم ہے کہ ان کی بھی تعظیم واجب ہے
بنامِ رہبری جو گمرہی تقسیم کرتے ہیں

گنا کرتے ہیں ساری زندگی ہم خواہشیں اپنی
اور آخرکار بچوں میں یہی تقسیم کرتے ہیں

اُنھی کی ذات سے شہرِ سخن آباد رہتا ہے
جو علم و آگہی ، دیدہ وری تقسیم کرتے ہیں

○○○

یہ دُھند خودغرضیوں کی چاہتوں کو کھا گئی
یہ بے حسی کی سرد لہر دوستوں کو کھا گئی

وہ منزلیں تو کیا میں گھر بھی لوٹ کر نہ آ سکا
یہ پُرفریب جستجو تو راستوں کو کھا گئی

یہ کیسی تشنگی کہ ساری لذتیں فنا ہوئیں
یہ کیسی اشتہا کہ میرے ذائقوں کو کھا گئی

یقین مانئے بلا سے کم نہیں ہے شاعری
مذاق ہی مذاق میں جو شاعروں کو کھا گئی

ملا ہے اس قدر سکوں کہ بے سکون ہو گئے
کچھ ایسی نیند آ گئی کہ رتجگوں کو کھا گئی

وہ کیسا ایک خواب تھا کہ بے کلی ہی چھن گئی وہ محویّت بپا ہوئی کہ کروٹوں کو کھا گئی

عجب جہان کُھل رہا تھا تیرگی میں آج تو
پھر ایسی پَو پھٹی کہ سارے منظروں کو کھا گئی

ooo

بصیرت جب بصارت میں سمائے گی تو دیکھیں گے
ہماری آگہی ہم کو دِکھائے گی تو دیکھیں گے

ابھی ہے قیدِ ہستی کے دَرودیوار سے نسبت
تحیّر سے رہائی آنکھ پائے گی تو دیکھیں گے

ادھورے منظروں میں جھانکنے کی کیوں کریں زحمت
عیاں ہو کر مکمل زیست آئے گی تو دیکھیں گے

یہ رُوٹھے زرد چہرے موسموں کے کس طرح دیکھیں
جو فصلِ گل فضاؤں کو منائے گی تو دیکھیں گے

سنو ! حُسنِ نظر کی کچھ حفاظت بھی ضروری ہے
جو پھر سے یہ زمیں خود کو سجائے گی تو دیکھیں گے

فلک کے راز کیا ہیں سوچنا موقوف کرتے ہیں
حقیقت جس گھڑی پردہ اُٹھائے گی تو دیکھیں گے

ooo

غزلیں

—شہزاد اسلم—

لوگ ہاتھوں میں ہیں پتھر لیے تیار کھڑے
پھر بھی شہزاد ہیں ہم آئینہ بردار کھڑے

ہم ہیں تزئینِ گلستانِ سخن کو نکلے
باادب راستے میں یونہی نہیں خار کھڑے

کیا کریں قحط میں گر خون سے سینچیں نہ انھیں
دیکھے جاتے نہیں یوں سوکھتے اشجار کھڑے

تخت کو تختہ بنائیں گے تمھارے یہی لوگ
ہاتھ باندھے ہوئے جو ہیں سرِ دربار کھڑے

کب وہ آئے گا مسیحا جسے کہتے ہیں سبھی
ایک اِک کر کے گرے جاتے ہیں بیمار کھڑے

بیچ حائل ہے زمانوں کی جدائی کا سفر
جاں بلب ہم ہیں اِدھر تو وہ اُدھر پار کھڑے

کیا مسافت کٹے اور کیا ملے منزل کا سراغ
پل جنھیں بننا تھا وہ ہیں بنے دیوار کھڑے

پیش کرنی ہے ہمیں آج غزل اُن کے حضور
سر جھکائے ہوئے سب فن کے ہیں معیار کھڑے

ooo

غزلیں

—محمود عامر—

ٹھنڈی آہیں بھرتے ہیں صرف اتنا کہنا ہے
لوگ تم پہ مرتے ہیں صرف اتنا کہنا ہے
دِل کھنچا چلا جائے آپ جب کبھی جاناں
ہنس کے بات کرتے ہیں صرف اتنا کہنا ہے
خود ہی موقع دیتے ہو نظرِ بد کو لگنے کا
اتنا کیوں سنورتے ہیں صرف اتنا کہنا ہے
پتھروں سے یاری میں کانچ کے بدن اکثر
ٹوٹ کر بکھرتے ہیں صرف اتنا کہنا ہے
جان جو ہتھیلی پر رکھ کے پیار میں اُتریں
کب بھلا وہ ڈرتے ہیں صرف اتنا کہنا ہے
گھر پلٹ نہیں سکتے راہِ عشق میں عامرؔ
جو بھی پاؤں دھرتے ہیں صرف اتنا کہنا ہے

○○○

جنگ لڑتے ہوئے سالار کے گر جانے سے
ہار ہو جاتی ہے تلوار کے گر جانے سے
بادشاہوں کو بھی خاطر میں نہ لایا جائے
سر پہ رکھی ہوئی دستار کے گر جانے سے
آتی جاتی بھی رہے سانس مگر انساں کی
موت ہو جاتی ہے کردار کے گر جانے سے
جانے ہو جاتے ہیں کتنے ہی پرندے بے گھر
لکڑیوں کے لیے اشجار کے گر جانے سے
پھوٹی کوڑی سے بھی کم نرخ لگیں ہیروں کے
دوستو گرمیِ بازار کے گر جانے سے

○○○

محبتوں کا وہ کال اُترا کہ صورتیں ہی بدل گئی ہیں
مرے قبیلے کی اب تو ساری ضرورتیں ہی بدل گئیں ہیں

وہ جھیل آنکھوں، گلاب ہونٹوں کے اب تو انداز ہی الگ ہیں
اک اجنبی کیا ملا کہ ظالم کی چاہتیں ہی بدل گئیں ہیں

نہ فون کرنا نہ خط ہی لکھنا جو آئے بھی تو پرے ہی رہنا
مری گلی چھوڑتے ہی اس کی تو عادتیں ہی بدل گئی ہیں

یہ مفلسی بھی عجیب شے ہے شعور بچوں کو دے گئی ہے
بہت ہی کم گو سے ہو گئے اب شرارتیں ہی بدل گئی ہیں

مرے بیاں جتنے سخت بھی ہوں سزا نہ قاتل کو ہو سکے گی
کرے گا کیا محتسب بھی عامر شہادتیں ہی بدل گئی ہیں

○○○

غزلیں

—لیاقت علی عہدؔ—

راستے تھے ، جنوں تھا ، اور میں تھا
منزلوں کا فسوں تھا ، اور میں تھا
یوں نکل آیا تیری بستی سے
دل کا پرچم نگوں تھا ، اور میں تھا
بے کفن لاش تھی محبت کی
تیرے ہاتھوں پہ خوں تھا اور میں تھا
ناز تھا تجھ کو حسن پر اپنے
مجھ کو فخرِ جنوں تھا ، اور میں تھا
تجھ کو فرصت نہیں تھی خوشیوں سے
حال میرا زبوں تھا ، اور میں تھا
کاش لوٹ آئیں وہ گئے موسم
ہر طرف جب سکوں تھا ، اور میں تھا
گھر کی چھت تھی پھٹی قبا جیسی
مفلسی کا ستوں تھا ، اور میں تھا
عہدؔ ناکامیوں کا قسمت میں
سلسلہ گوں ناگوں تھا ، اور میں تھا

○○○

تیری خواہش بہت دِقّت طلب تھی
غمِ جاناں ! مجھے فرصت ہی کب تھی
وجہ کچھ بھی نہ تھی میری خوشی کی
اُداسی بھی تیری کچھ بے سبب تھی
کیا بے چین تیری جستجو نے
یہ حالت میرے دِل کی پہلے کب تھی
بنائے دو جہاں جس کی سزا میں
خطا میری وہ کیسی میرے رب تھی
نہیں دیکھا تمہیں مِل کر بھی تم سے
میرے جذبوں کی یہ حدِ ادب تھی
کیا جلنے کا جب اقرار تو نے
تیرے پروانوں کی حالت عجب تھی
نظر جب پھیر لی سورج نے مجھ سے
میرے گھر چلنے کو تیار شب تھی

اُسے محسوس تو سب نے کیا ہے
نظر آتا خدا ، تو بات تب تھی

غزل

—طاہر عدیم—

خود جاتے ہیں الفاظ میں ڈھل، ترے نین کنول
میں لکھتا نہیں، لکھتے ہیں غزل، ترے نین کنول

شاداب، شفیق، شگفتہ ہیں، شبنم بھی ہیں
سچل، سچے، سچے، ہیں سجل، ترے نین کنول

نادان ، کنارِ وصل گریزاں رہتے ہیں
اور ہجر میں کرتے ہیں جل تھل ترے نین کنول

اس دنیا میں ہے جھیل سے گہری ذات مری
اور جھیل میں ہیں بس دو ہی کنول، ترے نین کنول

ہر بات عجیب اداؤں میں خود کرتے ہیں
خود جاتے ہیں پھر بات بدل، ترے نین کنول

ہر بھید ہے میرے دل کا اِن سے وابستہ
ہیں میری ہر مشکل کا حل ، ترے نین کنول

وہ ہجر کی تلخی ہو یا وصل کا ریشم ہو
ہر موسم میں ہیں جان اٹل ، ترے نین کنول

ہر زخم پہ طاؔہر پیار سے مرہم رکھتے ہیں
جب جسم مرا ہوتا ہے شل ، ترے نین کنول

OOO

غزلیں

— گلفام نقوی —

کوئی امکان بنتی جا رہی ہوں
تیری پہچان بنتی جا رہی ہوں
تجھے میں اپنی ساری خوشیاں دے کے
بہت نقصان بنتی جا رہی ہوں
پناہیں عشق کی جب سے ملی ہیں
کوئی مہمان بنتی جا رہی ہوں
کسی کونے میں جس کو رکھ دیا ہو
میں وہ سامان بنتی جا رہی ہوں
جسے تکمیل کی منزل مِلی ہو
میں وہ ارمان بنتی جا رہی ہوں
میرا گلفاؔم ہونا کم نہیں تھا
کہ اب عرفان بنتی جا رہی ہوں

○○○

ہائے وہ دِن بھی ہوا کرتے تھے
روزوشب ساتھ رہا کرتے تھے
اَن سنی کر کے زمانے بھر کی
ایک دُوجے کو سنا کرتے تھے
ہم جدا ہو کے جئیں گے کیسے
سوچتے اور ڈرا کرتے تھے
میرا جیون ہے ادھورا تجھ بن
یاد ہے تم یہ کہا کرتے تھے
میرے بھولے سے خفا ہونے پر
کتنے بے چین ہوا کرتے تھے
کتنے پرجوش تھے ہم چاہت میں
کوئی شکوہ نہ گلہ کرتے تھے
ایک دُوجے کے لیے زندہ رہیں
گُل یہی مِل کے دُعا کرتے تھے

○○○

غزلیں

— کاشف حسین غائر —

بنے ہیں کام سب اُلجھن سے میرے یہی اطوار ہیں بچپن سے میرے
ہوا بھی پوچھنے آتی نہیں ہے وہ خوشبو کیا گئی آنگن سے میرے
زمیں ہموار ہو کر رہ گئی ہے اُڑی ہے دُھول وہ دامن سے میرے
سنو اس دشت کا ہم زاد ہوں میں یہ واقف ہے اکیلے پن سے میرے
ہوائے بے دِلی بھی خوب نکلی۔۔۔
خلش تک لے اُڑی جیون سے میرے

OOO

ہر شام دِلاتی ہے اُسے یاد ہماری اتنی تو ہوا کرتی ہے امداد ہماری
کچھ ہیں بھی اگر ہم تو گرفتار ہیں اپنے زنجیر نظر آتی ہے آزاد ہماری
یہ شہر نظر آتا ہے ہم زاد ہمارا اور گرد نظر آتی ہے فریاد ہماری
یہ راہ بتا سکتی ہے ہم کون ہیں ، کیا ہیں یہ دُھول سنا سکتی ہے روداد ہماری
ہم گوشہ نشینوں سے ہے مانوس کچھ ایسی جیسے کہ یہ تنہائی ہو اولاد ہماری
اچھا ہے کہ دیوار کے سائے سے رہیں دُور
پڑ جائے نہ دیوار پہ اُفتاد ہماری

OOO

غزلیں

—گُل ریز فاطمہ—

ہم نہیں جانتے وفا کیا ہے   بے وفائی کی انتہا کیا ہے
زندگی آپ پر فدا کر دی   اس سے بڑھ کر مری خطا کیا ہے
عشق چاہت فریب ہے جاناں   اور اس کھیل میں رہا کیا ہے
دِل لگاتے نہ گر خبر ہوتی   اس حسیں جرم کی سزا کیا ہے
جھانک کر دِل میں دیکھ لیں اِک بار
جو نہیں جانتے خدا کیا ہے

ooo

رُوح گھائل ہے دِل درد سے چور ہے   آدمی پھر بھی جینے پہ مجبور ہے
مے چھلکتی ہے پیمانۂ وقت سے   زندگی ہے کہ سرشار و مسرور ہے
دِل میں رہتا ہے دھڑکن کی صورت کوئی   گو بظاہر نظر سے بہت دُور ہے
اپنی رُودادِ غم ہم سنائیں کسے   ہر کوئی اپنے زنداں میں محصور ہے
جیسے گُل میں ہو بے تاب خوشبو کوئی
جیسے ضو آنکھ کے تِل میں مستور ہے

ooo

غزل

—شکیل سروش—

یہ زمانہ آ گیا پھر میرے تیرے درمیان
بن گئے پھر پاؤں کی زنجیر یہ رسموں کے پھول

پھول کی ہر پنکھڑی پر تیری ہی تصویر تھی
اس طرح مہکے تھے شاخوں پر تری یادوں کے پھول

اس نے پھولوں کی جگہ بارود بھیجا ہے مجھے
میں نے اپنے خط میں بھیجے تھے جسے لفظوں کے پھول

سوچ کو مفلوج کر دیتی ہے دولت کی ہوس
بانجھ دھرتی پر کبھی اُگتے نہیں سوچوں کے پھول

کھول کر بیٹھا ہوں میں ماضی کی البم کو سروشؔ
مسکراتے ہیں جہاں پہ اَن گنت چہروں کے پھول

OOO

غزل

—شیخ اعجاز—

ظاہر کی آنکھ سے ہی تماشا کریں گے ہم
جب چشمِ دِل نہ وا ہو تو پھر کیا کریں گے ہم

چلنا پڑے گا ہم کو بھی دُنیا کے ساتھ ساتھ
لب پر کوئی سوال نہ لایا کریں گے ہم

بے لوث اب کسی سے نہ رکھیں گے واسطہ
اہلِ کرم کے ساتھ اب ایسا کریں گے ہم

اب اور زخم کھانے کی دِل میں نہیں ہے سکت
کیسے بھلا کسی کو اب اپنا کریں گے ہم

شعروں میں ڈھال دیں گے ترے خدوخال کو
کچھ ایسے تیرے حسن کا چرچا کریں گے ہم

جب بھی کبھی کبھار وہ آئے گا اپنے پاس
پلکوں کو اس کی رہ میں بچھایا کریں گے ہم

اعجاز دیکھ لی ہے زمانے کی بے حسی
اور اب نہ اس کی یاد میں تڑپا کریں گے ہم

غزلیں

—ضیاپرویز—

جو اشک تھا وہ رونقِ مژگاں نہیں ہوا
پھر غم کے آنسوؤں سے چراغاں نہیں ہوا

اِک لطفِ جاوداں ہے یہ رنج و الم ترا
اچھا ہوا کہ درد کا درماں نہیں ہوا

مقتل میں میری لاش پہ رونے کے باوجود
صد شکر اس کا چاک گریباں نہیں ہوا

کچھ ایسے اس سے دُوریوں کی مجھ کولت پڑی
میں خود سے دُور رہ کے پریشاں نہیں ہوا

سب رونقیں ہی لے گیا وہ گل بدن مرا
کیسے کہوں کہ شہر یہ ویراں نہیں ہوا

اتنا تو اس کو علم تھا اس بحرِ عشق کا
وہ ڈوب تو رہا تھا ہراساں نہیں ہوا

زندہ ہے یہ ضیاءؔ بھی سورج کے ساتھ ساتھ
وہ تو کسی بھی دُور میں پنہاں نہیں ہوا

OOO

یاد وہ نام مرے دستِ دُعا نے رکھا
غم کی دُنیا میں مجھے جس کی وفا نے رکھا

یوں چلے آئے ہیں وہ دِل کے نہاں خانے میں
جیسے گلشن میں قدم بادِ صبا نے رکھا

تیری صورت کو نگاہوں میں بسایا ہے کبھی
تیری یادوں کو کبھی دِل کے سرہانے رکھا

اور بڑھنے نہ دیا دِل کے جنوں کو اس نے
میرے ایماں کا بھرم اس کی حیا نے رکھا

شہر کے لوگ تو دُشمن تھے ہمیشہ میرے
میری عزت کا بھرم میرے خدا نے رکھا

تجھ سے مِل کر بھی مرے دِل کی اُداسی نہ گئی
شبِ تاریک میں سورج کی ضیاء نے رکھا

غزلیں

—عدنان سرفراز—

میرے غموں کا اثاثہ قلیل ہو جائے — یہ میرا ظرف اگر خودکفیل ہو جائے
یہ آگ وقت کی گلزار میں بدل جائے — جو آدمی کا عقیدہ خلیلؑ ہو جائے
کوئی نہ پیاسا رہے گا اذیتوں میں بھی — میرا لہو بھی جو سُکھ کی سبیل ہو جائے
نگاہِ یار کی شوخی جو دیکھے خلوت میں — تو آئینہ بھی حسین و جمیل ہو جائے
تقاضا پیار کا کرنے لگیں جب اہلِ جہاں — کرے گا کیا کوئی جب دِل بخیل ہو جائے

یہ چشمِ نم بھی سکوں کی طلب میں ہے مولا!
کرم اِدھر بھی اے ربِ جلیل ہو جائے

OOO

مجھے پتھر بنایا جا رہا ہے — میرا دامن جلایا جا رہا ہے
ہوئے استاد بھی مدّاح میرے — سبق ایسا پڑھایا جا رہا ہے
دُھواں اُٹھا ہے پھر صحرا سے شاید — کوئی خیمہ جلایا جا رہا ہے
میری تکمیل کے گوشے ہیں خالی — مجھے یزداں بنایا جا رہا ہے
صداقت کا تو ہر پتھر ہے بھاری — اسے غنچہ بنایا جا رہا ہے
غمِ ہستی سے اب ہو کر گریزاں — نیاؔ اِنساں بنایا جا رہا ہے

زمانے کو جو ہیں عدنانؔ پیارے
انھیں بھی اب ستایا جا رہا ہے

نظمیں

—فہیم شناس کاظمی—

اب رات ڈھل رہی ہے

مجبور سا وہ بوڑھا
مہتاب اور تارے
دیوار و در پہ پہرہ دیتے سیاہ سائے
سڑکوں پہ گشت کرتے
تاریکیوں کے پالے
اور کھڑکیوں سے باہر
چھنتے ہوئے اُجالے
سب گھر کو جا رہے ہیں
اب رات ڈھل رہی ہے
کیوں طاقچے میں دِل کے
اک شمع جل رہی ہے
خاموش سی گلی ہے
دروازہ تھک چکا ہے
کھڑکی بھی سو چکی ہے
خواہش کی کالی سڑکوں پر اوس پڑ چکی ہے
بجلی کی ننگی تاریں
عریاں سی خواہشیں ہیں
ہر راہ پر تنی ہیں
سب لیمپ پوسٹ اپنی
خواہش کے بوجھ سے اب
یوں سرنگوں ہوئے ہیں
پاتال سے لگے ہیں
پاتال۔۔۔
جس میں رقصاں
بے آبرو سے جذبے
عریاں سے خواب رقصاں
سب سرنگوں ہوئے ہیں
سب ہار سے گئے ہیں
اب
رات
ڈھل رہی ہے

آئینہ دیکھتے ہو

آئینہ دیکھتے ہو
اِس کے آداب تو پہلے سیکھو
خاک میں خونِ رگِ جان ملا کر دیکھو
آنکھ دریا تو بنا کر دیکھو
شام کی ٹھنڈی ہوا رستوں کو دے گی بوسہ
آنکھ میں خواب سمندر کا اُتر آئے گا
رنگ میں رنگ ملیں گے
گیت چھیڑیں گے جو دریا کے کنارے اشجار
آگ میں آگ ملے گی
زندگانی سر بازارِ حیات
رقص کرتے ہوئے جو دام لگائے اپنے
رقص کرتے ہوئے روتی جائے
اور روتے ہوئے ہنستی جائے
آئینہ دیکھتے ہو
سطحِ دریا پہ جہاں کائی بنے آئینہ
چاندنی جھیل کی لہروں پہ ہے آئینہ
اشک آنکھوں سے گرے اور بنے آئینہ
ساربانوں کے قدم چومتے دشت بنے آئینہ
آتشِ غم سے جلے دِل تو بنے آئینہ
ریت آئینہ
اور وہ سارا جہاں آئینہ ہے
آنکھ سے صاف کرو گرد
نظر تیز کرو
خاک میں خواب ملاؤ
دِل کو جنوں خیز کرو

پھر کچھ بھی یاد نہیں رہتا

آنکھوں کے نمیدہ ساحل پر
جو رنگ کبھی تم نے بوئے
وہ خواب ہوئے
اور ایک سمندر جاگتا ہے
اور گہری سانسیں لیتا ہے وہ رات گئے
رات گئے سب آوازیں سو جاتی ہیں
سب پریاں
شہزادوں کے خوابوں میں سو جاتی ہیں
سبز گھنیرا جنگل
نیلا سمندر گہری سانسیں لیتے ہیں
شور لہو میں بدمستی میں ناچتا ہے
پھر کچھ بھی یاد نہیں رہتا
اور کاہکشائیں ٹوٹتی ہیں
اور مست ہوا کے جھونکوں سے
رنگوں کی کھڑکیاں ٹوٹتی ہیں
پیراڈائز کی چوٹی سے
چاند چھلانگ لگاتا ہے
ساحل روتا رہتا ہے
اور کوئی آنکھ سوائے میرے
اس کے ساتھ نہیں روتی
اور تاعمر نہیں سوتی

نظمیں

—جمشید مسرور—

رقاصہ

جہاں بحر ہے
رستے حباب
مسافرت کا زمیں پر عذاب
زمین سرد ہے
دستِ ہوا نہ شاخِ گلاب
وہی ہے کل کے وہی آج کے سفر کا حساب

بنا نہ حلقۂ بازو اُٹھی ہوئی شمشیر
چلا نہ جُنبشِ ابرو کا تیر
بدن کُھلا نہ عیاں ہو سکا زرِ پہلو
رُکا رُکا رمِ آہو
تھکے تھکے سے بدن کی تھکی تھکی خوشبو
وہ ایک کمرۂ تاریک
نہ رقص کے لیے موزوں نہ پیار کے لیے ٹھیک
وہ لین دین عجب تھا سوال تھے نہ جواب

جمالِ زر پہ لٹا پھر زرِ جمال اس کا
فقط نگاہ پہ نا چا نہ شعلہ رنگ شباب
رہے گا کل بھی مگر شوق کو خیال اُس کا
تمام زہر پلا دے مجھے بہاروں کا
اُتر گیا مری رگ رگ میں کل جو رات گئے
وہ آرزو نہیں سیماب ہے ستاروں کا
کٹے نہ کاٹ کہیں دیکھنا
لگے نہ پاٹ کہیں دیکھنا
جنوں کو اب کے نہیں حوصلہ کناروں کا

ooo

تھکن

نہ رات چاند کی محفل نہ صبح پھولوں کی
جمود سا مرے گھر کی فضا پہ طاری ہے
ہر ایک شام کچلتا ہے سنگِ تنہائی
ہر ایک رات مری زندگی پہ بھاری ہے
تھکی تھکی سی ہوائیں بجھا بجھا ماحول
ترے بغیر طبیعت اُداس رہتی ہے
ابھی حصولِ تمنا ہے خواب بے تعبیر
ابھی نگاہِ محبت کی پیاس رہتی ہے
نہو کہ زندگی بے کار ہی گزر جائے
نہو کہ تیری تمنا کا نقش مَر جائے
جوانیوں کے چمن پر خزاں نہ آ جائے
صبا کے صحن میں بوجھل دُھواں نہ آ جائے
زمانہ تیرے مرے درمیاں نہ آ جائے

نظمیں

—جلیل ہاشمی—

گفتگو

ہماری سبھی گفتگو جس میں ہم رات دِن محو رہتے تھے
شاید کوئی گفتگو ہی نہیں تھی
کہ جس کا کوئی ربط ہوتا
معانی سے، رِشتوں سے یا زندگی سے
مگر ہم کسی خواہشِ بے اماں میں
مسلسل کیے جا رہے تھے وہ باتیں
جو لفظوں کو آزردہ کرنے کی باعث ہوئی تھیں
ہوا جس کو سب کچھ خبر تھی
اُڑا لے گئی ہم سے وہ لفظ جو ہم
معانی کو سمجھے بنا بولتے تھے
ہوا جو ہمیشہ سے سب کچھ مٹانے پہ مامور ہے
کیسے محفوظ رکھتی ہماری کسی بے سبب گفتگو کو
یہ معمول کی کارروائی تھی اس کی
کہ تحلیل کر آئی اپنی سبھی گفتگو کو
صداؤں کے اس شور میں
جس کا مفہوم کچھ بھی نہیں ہے
سو اے دوست لڑکی!
کھلا یہ کہ ہر گفتگو بے سبب شور ہے اپنی وحشت کا لیکن
محبت فقط ایک ہی لفظِ زندہ ہے
جس کی صدا ان فضاؤں میں یونہی سلامت رہے گی
بشرطیکہ ہم اس کے معنی سمجھ کر
اسے لوحِ محفوظ پر نقش کرنے کی
خواہش میں یہ زندگی نذر کر دیں
کہ جس کو ہوا برد ہونے سے بچنے کی خاطر
ہمیں آزمائش کی اک زندگی اور درکار ہوگی
نہیں تو ہماری سبھی گفتگو
یونہی بے کار ہوگی

اس کے بعد آئے بلا سے کوئی طوفاں آئے

تم مجھے چاہتی ہو یا کہ نہیں چاہتی ہو
ایک نیکی تو بہر حال کما سکتی ہو
میں تمہیں یاد یونہی کرتا رہوں گا لیکن
تم تو اس ربط کی قندیل بجھا سکتی ہو
اس کے بعد آئے بلا سے کوئی طوفاں آئے
اور اس رات میں مر جائے کوئی، یا یوں ہو
میرے غم خانے میں تم سا کوئی مہماں آئے

تمہارا بوسہ وصال ہے

کہ صد ہزار شوق اور لذتوں کا اِک کمال ہے
کہ بس مرا خیال ہے
اِک ایسا کیف ہے
کہ جس سے میرے جسم و جاں تو کیا
مری فسردہ رُوح بھی نہال ہے
تمہیں بھی خود خبر نہیں
تمہاری اس سپردگی کے صرف ایک لمس میں مرے لیے
کئی ہزار ذائقے ہیں مشترک
تمہاری طاہرہ زباں کا لطفِ جانفزا
تمہارے دہن کا مزا
تمہارے ہونٹ کا یہ شہد
تمہاری ناک کا نمک

OOO

مجھے کمرے سے باہر لے چلو

—احمد شہباز خاور—

مجھے کمرے سے باہر لے چلو
در و دیوار سے وحشت سی ہوتی ہے
مرے اجداد کی تعمیر کردہ
یہ پرانی چھت
میری آنکھوں میں چبھتی ہے
مجھے کمرے سے باہر لے چلو
ہوائیں ساحلوں کی ریت پر میرے لیے
اس پار کے پیغام لکھتی ہیں
سمندر کی تہوں سے اُٹھنے والی بے قراری کو
مجھے چھونے کی حسرت ہے
وہ اَن دیکھے جزیرے
جن میں خودرو پھول کھلتے ہیں
مرے قدموں کی آہٹ کو ترستے ہیں
سحر سے کچھ پرے
پتوں پہ شبنم کے اُترنے کی
انوکھی اولیں آواز آتی ہے
کسی خوشبو کے سینے میں

دھڑکتے دِل کی بے چینی بلاتی ہے
مجھے کمرے سے باہر لے چلو
مری پیاسی سماعت
ہونے نہ ہونے کے اس اقرارنامے پر
دوبارہ بات کرنے کو ترستی ہے
کہ جس پر ایک مدت سے نہیں ہے گفتگو کوئی
چلا ہے سر اُٹھا کر کوئی جذبہ
اور نہ خوش ہے آرزو کوئی
پہاڑوں میں رواں چشموں کے
ٹھنڈے اور میٹھے پانیوں والے وہ مشکیزے
میرے ترکش
میرے بھالے
میرے گھوڑوں کی آنکھوں میں مسافت کے نشے
اب بھی مجھے مخمور رکھتے ہیں
گھنے جنگل میں آہو کا تعاقب کرتے کرتے
دُور تک جانے کی خواہش سر اُٹھاتی ہے
سوئمبر کی کوئی پرشوق رونق
میری نصرت کے ترانے گنگناتی ہے
بہت نزدیک سے اِک دُور کی آواز آتی ہے
مجھے کمرے سے باہر لے چلو
مری بجھتی ہوئی آنکھیں
کھنڈر اندر کھنڈر ہیں
کتنی صدیوں سے یہاں کوئی نہیں آیا
سمے کی نیلگوں آنکھوں نے حیرت کے کسی روزن سے
اندر ہی نہیں جھانکا

پرانی بالکونی پر کوئی آہٹ نہیں جاگی
شکستہ در کسی دستک کے کب سے منتظر ہیں
کھلے بازو
کسی مہمان کی آمد کا قصہ بھول بیٹھے ہیں
مجھے پھر سے وہیں سے جوڑ کر قصہ سنانا ہے
پرانے منظروں کے زاویے اکثر شکستہ ہیں
اُنھیں پھر سے بنانا ہے
بہت لمبی مسافت ہے
بہت ہی دُور جانا ہے

نظمیں

—رامش منہاس—

اِس طرح بھی ہوتا ہے

وقت کے سمندر میں
یک بیک کئی لہریں اِس طرح بھی اُٹھتی ہیں
جن کی آہ وزاری سے
ساحلوں پہ خوابیدہ سیپیوں کے زخمی دِل
ٹوٹ ٹوٹ جاتے ہیں
اِس طرح بھی ہوتا ہے
زندگی کے بیلے میں
سرد گرم موسم میں
چاہتوں کے سب پنچھی ہجرتیں بھی کرتے ہیں
کرب سے گزرتے ہیں
راستوں میں مرتے ہیں
اس طرح بھی ہوتا ہے
زندگی کے میلے میں
ہاتھ چھوٹ جاتے ہیں
ساتھ ٹوٹ جاتے ہیں
اور اس محبت کو۔۔۔عمر بھر کی چاہت کو
زہر چند لمحوں کا اس طرح سے ڈستا ہے
سانس ٹوٹ جاتی ہے

دُعا

میرے مالک!
بھیج دے ایسا ساون کوئی
جس کی بوندیں
جس کی رِم جھم
من کے اندر جلنے والے اس دوزخ کو
ٹھنڈا کر دے

جب وہ برسے
کالے دھن سے بننے والی ہر اِک چھت سے
کالک ٹپکے
لیکن اس ساون کی رِم جھم
کچی قبروں کی مٹی کو یوں مہکائے
جیسے پھول کوئی کِھل جائے
بھیج دے ایسا ساون کوئی
بھیج دے ایسا ساون کوئی

ooo

نظم

جب گلاب موسم میں
تتلیوں کے چہروں پر
زردیاں اُتر آئیں
دلنشین رنگوں کے
پر تمام دُھل جائیں
جان لو کہ گلشن میں
کچھ بلائیں اُتری ہیں

عجیب ہو تم

—سمیرا نقوی—

عجیب ہو تم
ہَوا سے رِشتہ جڑا ہوا تھا
ہَوا سے رِشتہ چُھڑا رہے ہو
جو آمد و رفت سانس کی ہے
بڑے سلیقے سے
زیست کا کام چل رہا تھا
اسے بھی تم مستعار لے کر
چراغ کی لَو بُجھا رہے ہو
عجیب ہو تم
نظر میں منظر تھے کیسے کیسے
یہ سارے منظر اِک ایک کر کے
ہٹا رہے ہو
یہ زندگی اور رنگ اس کے
یہ رنگ اس کے جو خوب تر ہیں
انھیں نظر سے گرا رہے ہو
اب اور جینا بھی
چاہ رہے ہو
عجیب ہو تم

شاعر

—شیخ اعجاز—

اک روز گھر میں آئے تو جاری تھا تذکرہ
بیٹا ہوا جوان ، ہو شادی کا سلسلہ
پڑھ لکھ کے چار پیسے کمانے لگا ہے یہ
انکم سے اپنی گھر کو چلانے لگا ہے یہ
بہتر ہے اس کو قیدِ محبت میں ڈال دیں
بیوی کو لا کے تھوڑا مشقت میں ڈال دیں
کچھ دِن سے حال اس کا عجب سا ہے ہو گیا
جیسے کسی کے عشق میں بے چارہ کھو گیا
اختر شماری دیر تک کرنے لگا ہے یہ
چھپ چھپ کے اب تو آہیں بھی بھرنے لگا ہے یہ
آزاد اس کا رہنا تو خطرے کی بات ہے
شعروں میں بات کہنا تو خطرے کی بات ہے
قسمت خراب اپنی کہ شاعر یہ بن گیا
تشبیہ و استعارہ کا ماہر یہ بن گیا
آ کے کرے گا ہم سے یہ اہلِ سخن کی بات
بحروں کی قافیوں کی ، ردیف و وزن کی بات

اس کے تخیلات کو نہ پا سکیں گے ہم
شاعر کی سوچ تک نہ کبھی جا سکیں گے ہم

فوراً ہی کر دو شادی کہ جائے نہ ہاتھ سے
محروم ہوں نہ ہم کہیں بیٹے کے ساتھ سے

اگلے ہی روز سب چلے لڑکی کو دیکھنے
ہمراہ ہم بھی ہو لیے بیوی کو دیکھنے

پہلی جگہ جو پہنچے تو سب کچھ ہی ٹھیک تھا
لڑکی بھی اچھی خاصی تھی اور گھر بھی ٹھیک تھا

لیکن سوال سنتے ہی بددِل سے ہو گئے
جذبات شاعری کے کہیں جا کے سو گئے

پوچھا گیا یہ ہم سے بتاؤ تو شیخ جی
دونوں میں کون اچھی ہے بیوی کہ شاعری

ایسا سوال کرنا کم عقلی کی بات ہے
دونوں عزیز ہیں ہمیں سیدھی سی بات ہے

بعد اس کے ہم تو پھر کہیں ملنے نہیں گئے
قسمت سے خود ہی ہو گئے شادی کے سلسلے

شادی ہوئی تو مشکلیں آسان ہو گئیں
بیگم ہماری شاعری کی جان ہو گئیں

بیوی کا دِل و جان سے رکھتے ہیں ہم خیال
ان کو ہماری شاعری کا کچھ نہیں ملال

لازم ہے اہلِ فن کو فراست سے کام لیں
بیوی کے باب میں ذرا عزت سے کام لیں

اتنا نہ شاعری میں مگن خود کو کیجیے
تھوڑا سا وقت بیوی کو گھر میں بھی دیجیے

ورنہ یہ جان ناتواں مشکل میں آئے گی
تنگ آ کے بیوی ہاتھ میں بیلن اُٹھائے گی

شاعر تو زندگی کی لطافت کا نام ہے
دِل کا سرور پیار و محبت کا نام ہے

بے شک نہیں ہے شاعری ہر آدمی کا کام
ملتا کسی کسی کو ہے اللہ کا یہ انعام

شاعر نہ ہوں تو کون سجائے گا محفلیں
بے کیف زندگی میں لگائے گا رونقیں

گر ہو نہ شاعری تو ترنم کہاں سے ہو
آواز کا نہ جادو اُجاگر زباں سے ہو

شاعر زبان بنتا ہے لوگوں کے واسطے
ہلکان خود کو کرتا ہے لوگوں کے واسطے

کیسے یہاں یہ لوگ چھپاتے ہیں اپنا حال
شاعر کا نام لے کے سناتے ہیں اپنا حال

شکوہ سرائی ہو کہ وہ حسرت کی بات ہو
راز درونِ دِل یا محبت کی بات ہو

الغرض شاعری کو ہی لاتے ہیں کام میں
خود کو چھپا کے رکھتے ہیں شاعر کے نام میں

اوروں کے کام آنا ہے شاعر کی زندگی
غم کو گلے لگانا ہے شاعری کی زندگی

اعجازؔ چاہے تیرا نہ شعرأ میں نام ہو
انسانیت میں ہاں مگر اُونچا مقام ہو

ooo